دوسرا حصہ

جس سے کتب مقدسہ کی خاص تعلیمات کو پیش کرنا اور جیسا تمہید میں بیان ہوچکاہے یہ دکھانا مقصود ہے کہ ان کی تعلیمات سچے الہام کے معیار کے بالکل موافق ومطابق ہیں

پہلا باب

مضامینِ مندرجہ بائبل کا مختصر بیان

بائبل عہدِ عتیق وجدید دوحصوں میں منقسم ہے۔ اکثر اوقات عہدِ عتیق کو توریت اور عہدِ جدید کو انجیل کہتے ہیں کیونکہ ان دونوں حصوں میں موسوی شریعت اورانجیل شروع میں آتی ہے۔

یہ بیان پہلے حصہ کے پہلے باب میں کیا جاچکاہے کہ یہود عہد عتیق کو تین حصوں میں تقسیم کرتے تھے یعنی (۱) توریت (۲)انبیا اور (۳) صحائف زمانہ قدیم میں صحائف کو زبور بھی کہتے تھے کیونکہ ان کے شروع میں زبور کی کتاب ہے۔ عہدِ عتیق باستثنایِ چند ابواب جوارمنی زبان میں لکھے گئے تھے سب کا سب پہلے عبرانی زبان میں مرقوم ہوا ۔ عہدِ جدید کی اصلی زبان یونانی ہے۔ یہودیوں نے نہایت ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ اب تک عہدِ عتیق کو اس کی اصلی زبانوں میں محفوظ رکھا۔ مسیحیوں نے خود سیدنا[1] مسیح کی تصدیق وتائید کے ساتھ عہدِ عتیق کو یہودیوں سے قبول کیاہے۔ ہماری کتبِ عہدِ عتیق بالکل وہی ہیں جو سیدنا مسیح کے زمانہ میں ملکِ فلسطین میں یہودیوں کے پاس تھیں اور زمانہ حال میں تمام ممالک میں ہیں۔

عہدِ عتیق میں وہ الہام الہیٰ مندرج ہے جو مسیح کی آمد سے پیشتر انبیا ودیگر مبعوثین ایزدی کے ہاتھ سے مرقوم ہوا ۔ اکثر کتب کے لکھنے والوں کے نام بھی لکھے ہیں لیکن بعض کتب کے لکھنے والوں کے ناموں کے بارے میں فقط روایات ہیں تو بھی چونکہ ہمارے سیدنا مسیح نے جیسا کہ قرآن[2] میں مذکور ہے ان تمام کتب کی تصدیق کی ہے اس لئے ہمارا ان کو قبول کرنا بالکل بجا ہے۔ زمانہ قدیم میں عہدِ عتیق عبرانی حروف کے شمار کے موافق بائیس کتابوں[3] میں منقسم تھا۔ زمانہ حال میں یہودی روت کی کتاب کو قاضیوں کی کتاب سے اوریرمیاہ کے نوحہ کو اس کی پیشینگوئیوں سے جدا کرکے چوبیس کتابیں شمار کرتے ہیں۔ سموئیل وسلاطین اور تواریخ کو بھی عموماً دو دو کتابوں میں تقسیم کرتے ہیں اور بارہ انبیایِ اصغر کو ایک ہی کتاب نہیں بلکہ جدا جدا بارہ کتابیں شمار کرتے ہیں۔ لہذاآج کل کتبِ عہدِ عتیق کا شمار بائیس نہیں بلکہ انتالیس ہے لیکن جیسا کہ مجملا کا خیال ہوسکتا ہے اس سے ہر گز ہر گز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کتب مقدسہ میں کچھ بڑھادیا گیاہے۔

توریتِ موسیٰ میں پانچ کتابیں شامل ہیں یعنی پیدائش ، خروج، احبار، گنتی اور استثنا۔ ان کتابوں میں دنیا اورانسان کی پیدائش کا حال مندرج ہے اور نیز یہ کہ تمام بنی نوع انسان کے باپ آدم نے کس طرح سے خدا کی نا

---

[1] متی ۵: ۱۷تا- ۲۱: ۴۲- ۲۶: ۵۴- مرقس ۱۲: ۲۴- لوقا ۲۴: ۲۷، ۴۵- یوحنا ۵: ۳۹- وغیرہ وغیرہ

[2] سورہ مائدہ آیت ۵۰

[3] پہلاحصہ تیسرا باب

فرمانبرداری کی اور گناہ میں گر کرموت کا وارث بنا لیکن ۔خدایِ رحیم نے عورت کی نسل سے ایک نجات دہندہ بھیجنے کااسی وقت وعدہ فرمایا (پیدائش ۳: ۱۵) جب بنی آدم گناہ میں غرق ہوگئے اورہر طرح کی بے رحمی کے مجرم ٹھہرے تو خدا نے حضرت نوح اور اس کے خاندان کے سوا تمام نوعِ انسان کو نیست ونابود کرنے کے لئے طوفان بھیجا۔ طوفان کے بعد وہ تمام اقوام جو حضرت نوح سے پیدا ہوئیں رفتہ رفتہ خدایِ برحق کی عبادت سے دورہوگئیں۔ لیکن اس وقت تمام بنی آدم میں سے اللہ جل شانہ نے ایک حضرت ابراہیم کو منتخب کرلیا جس نے فقط خدایِ واحد وبرحق ہی کی عبادت کی۔ خداوند کریم نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے اس کے ایمان کے سبب سے یہ وعدہ[1] فرمایا کہ کہ آنے والا نجات دہندہ تیرے فرزند اسحاق کی نسل سے ہوگا۔ اسحاق کے دوبیٹوں میں سے خدا نے یعقوب کو منتخب کیا اوراسے اسرائیل[2] کہا جو وعدہ حضرت ابراہیم سے کیا تھا اب دوبارہ اس کے ساتھ کرکے فرمایا کہ زمین[3] کے تمام گھرانے تجھ سے اور تیری نسل سے برکت پائینگے۔ پھر اسی وعدہ کے ایفا میں خدایِ قادر نے اس کی نسل سے انبیاء کو مبعوث فرمایا تاکہ جیسا قرآن[4]میں بھی مرقوم ہے سچی دانائی کے ساتھ ذوالجلال کی مرضی کو ظاہر کریں اور الہیٰ الہام سے اس کتاب کو تحریر کریں جو مسیحِ موعود پر شہادت دے۔

[1] پیدائش ۱۲: ۱تا۳-۱۵: ۶-۱۷: ۱۵تا۲۱،۱۸: ۱۸-۲۲: ۱۸

[2] پیدائش ۳۲: ۲۸

[3] پیدائش ۲۸: ۱۴

[4] سورہ الجاثیہ آیت ۱۵

لیکن اللہ جل شانہ کے اس وعدہ کے پورا ہونے سے پیشتر یہ ضروری امر تھا کہ بنی اسرائیل تمام بنی آدم کے دینی معلم ہونے کے لئے مناسب طور سے تعلیم وتربیت حاصل کریں۔ توریت میں مرقوم ہے کہ وہ کس طرح ملکِ مصر میں پہنچے اور کس صدہا سال تک وہاں بودوباش کرتے کرتے ایک بڑی قوم بن گئے ۔جب آخر کار فرعون (شاہ مصر) نےان پر سخت ظلم وستم کیا تو حق سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو مبعوث فرمایا اوراس کے وسیلہ سے ان کو مصر سے نکال لایا(قریباً ۱۳۲۰ سال قبل از مسیح یا یہودیوں کے بیان کے موافق ۱۳۱۴ سال قبل از مسیح)۔ پھر خدا نے کوہِ سینا پر اپنے جلال کو بنی اسرائیل پر ظاہر فرمایا اوربہت سی دیگر ہدایات کے ساتھ ان کو دس[5] احکام عطا کئے۔ یہ سب کچھ توریت میں مرقوم ہے۔موسوی شریعت کی ایک غرض یہ تھی کہ لوگ قدس الہیٰ کا عرفان حاصل کرسکیں اوراس میں ترقی کریں۔ باستشنایِ بنی اسرائیل اس تعلیم سے کوئی بھی آشنا نہ تھا اور زمانہ حال میں بھی یہود ونصاریٰ کےسوا سب لوگ اس سے بے بہرہ ہیں۔اس شریعت کی غرض ثانی یہ تھی کہ بنی اسرائیل اپنے قرب وجوار کی بے دین وبت پرست اقوام میں غلط ملط ہونے سے محفوظ رہیں تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بے دینی کی تاریکی نورِ حق اور توحیدِ الہیٰ کو پوشیدہ کردے۔ اس جدائی کی ضرورت مطاع[6] اقوام اور دنیا کے نجات دہندہ کی آمد تک ہی تھی۔

[5] خروج ۲۰

[6] پیدائش ۴۹: ۱۰

چالیس سال کی آوارگی اور بیابان کے مختلف حصوں میں بودو باش کے بعد خدا نے بنی اسرائیل کو ملک کنعان[1] کی موعودہ سر زمین کے کنارہ تک پہنچایا۔ یشوع کی کتاب میں یہ مرقوم ہے کہ بنی اسرائیل نے ملکِ کنعان کو فتح کیا۔ اور وہاں کی بت پرست اقوام کو جن کی بدکاری کے سبب سے خدا نے ان پر قہر نازل کیا تھا کسی قدر نیست و نابود کیا۔ وہ اپنے بچوں کو جھوٹے معبودوں کے سامنے زندہ جلال دیتے تھے اور جن بدروحوں کی پرستش کرتے تھے ان کی عظمت کے اظہار میں نہایت مکروہ[2] شہوت پرستی میں مشغول ہوتے تھے۔ ہم کو یہ بتلایا گیا ہے کہ خدا نے جو وعدہ حضرت ابراہیم سے کیا تھا اس کے مطابق بنی اسرائیل ملکِ کنعان پر قابض ہوگئے۔

کتبِ قضاۃ وروت وسموئیل وسلاطین اور تواریخ میں بنی اسرائیل کی تواریخ کے بڑے بڑے واقعات اس زمانہ سے لے کر بابل کی اسیری کے ایام تک مندرج ہیں۔ جب بنی اسرائیل ملکِ کنعان میں آباد ہوگئے تو کئی سو سال تک بار بار بُت پرستی میں مبتلا ہوئے اور خدا نے ان کو سزا دی اور آس پاس کے باقی ماندہ بے دین حاکموں کو ان پر ظلم وستم کرنے دیدیا لیکن جب کبھی اس کے لوگ توبہ کرکے اس کی طرف رجوع لائے تو اس نے نہایت رحم سے ان کو معاف فرمایا اور ان کے درمیان بڑے بڑے بہادر جنگی مرد پیدا کرکے ان کو ان کے دشمنوں سے بچایا۔ ان کے پہلے بادشاہ ساؤل قرآنی طالوت[3] کے عہد سلطنت کے بعد خدا نے قریباً ۱۰۲۰ سال قبل از مسیح حضرت[4] داؤد کو بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر کیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سلیمان[5] بادشاہ ہوا جس نے ۹۸۰ سے ۹۳۸ سال قبل از مسیح تک سلطنت کی۔ تواریخ بائبل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح سے بنی اسرائیل کے دس فرقوں نے سلیمان کے بیٹے رحبعام سے بغاوت کرکے اسرائیل کی جدا سلطنت قائم کی اور داؤد کے خاندان کے پاس فقط یہوداہ کی سلطنت باقی رہ گئی۔ اسرائیل کی سلطنت بہت جلد بتُ پرستی میں مبتلا ہوگئی اور پھر کچھ عرصہ بعد سلطنت یہوداہ کا بھی یہی حال ہوا۔ اس لئے اہل اسیریا ہو کر میدیا وفارس اور دیگر ممالک کو گئے۔ یہ حادثہ ۷۳۰ سال قبل از مسیح وقوع میں آیا۔ سلطنتِ یہوداہ نے بھی یہی بری راہ اختیار کی اور ۶۰۶ سال قبل از مسیح اہل بابل سے مشہور ہوئی۔ اس وقت سے لے کر ۷۰ سال یعنی ۵۳۶ قبل از مسیح تک بابل میں قید رہے۔ ۵۸۷ قبل از مسیح میں نبوکد نضر شاہِ بابل نے اس ہیکل کو مسمار کیا جو سلیمان نے یروشلیم میں تعمیر کی تھی اور بزرگانِ یہود کو قید کرکے بابل کو لے گیا۔

عزرا کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ ۷۰ سال کی اسیری کے ایام جن کا یرمیاہ[6] نبی نے بیان کیا تھا گذر گئے تو خداوند کریم نے اردشیر دراز دست شاہ فارس کے دل کو پھیر کر ان کو رہائی بخشی۔ اردشیر درازست بابل اور بہت سے دیگر ممالک کا بادشاہ بن گیا تھا۔ اس نے بنی اسرائیل کو کنعان کی طرف مراجعت کرنے کی پھر اجازت دیدی۔ ہیکل کی بحالی اور یروشلیم کے

---

[1] گنتی ۳۶: ۱۳۔ استشنا ۳۱: ۱

[2] احبار ۱۸: ۲۴تا ۳۰۔ استشنا ۹: ۴تا ۵۔ ۱۸: ۹تا ۱۴۔

[3] سورہ بقرہ آیت ۲۴۸۔

[4] سورہ بقرہ آیت ۲۵۶

[5] سورہ انعام آیت ۸۵

[6] یرمیاہ ۲۵: ۱۱، ۱۲

دوبارہ تعمیر ہونے کا بیان عزرا اور نحمیاہ کی کتابوں میں مندرج ہے لیکن جب یہودیوں نے جیسا کہ انجیل میں مرقوم ہے کہ موعودہ نجات دہندہ سیدنا مسیح کورد کردیا تو اس نے پیشینگوئی کی اور بتلادیا کہ ان پر بڑا سخت عذاب آئیگا اور ہیکل برباد[1] ہوجائیگی۔ اس پیشینگوئی اور حضرت موسیٰ کی پیشینگوئی[2] کے مطابق ۷۰ ء میں رومیوں نے شہر اور ہیکل دونوں کو مسمار کردیا۔ اس وقت سے آج تک یہودیوں کو کبھی اپنا ملک اور اپنا بادشاہ نصیب نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ روئِ زمین پر پراگندہ اور بسا اوقات سخت بے رحمی اور ظلم برداشت کرتے رہے ہیں۔ تاحال انکی مصیبت[3] کے ایام کا خاتمہ نہیں ہوا۔

بائبل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل سے ایسا سلوک کرنے اور مورخین وانبیاء سے ان کے اہم ترین تواریخی واقعات تحریر کروانے میں خدا کو مورِ ذیل ملحوظ تھے۔ (۱) یہ کہ خود یہودی اور بعد میں دیگر اقوام بخوبی سمجھ لیں کہ انسان کا دل بدی اور بغاوت کی طرف اس قدر مائل ہے کہ باوجودیکہ اس ذاتِ پاک نے بڑا رحم کیا اور بڑی بڑی برکتیں بخشیں اوراپنے مقدس انبیاء کے وسیلہ سے ہمیشہ ہدایت فرمائی تو بھی بنی آدم کے لئے خدایِ برحق کو بھول کربت پرستی میں مبتلا ہونے کا امکان باقی رہا۔ (۲) یہ کہ بنی اسرائیل یہ معلوم کریں کہ فقط احکامِ الہیٰ کو جانتے اور ظاہری دینی رسوم کو بجالانے سے گناہ اور جسمانی شہوات کے زور سے نجات ومخلصی حاصل نہیں کرسکتے بلکہ کچھ اس سے بڑھ کر عمل میں لانا ضروری ہے تاکہ اس طرح سے ان کے دلوں میں رفتہ رفتہ

[1] متی ۲۴، مرقس ۱۲ اور لوقا ۲۱

[2] استشنا ۲۸: ۶۲۔

[3] متی ۲۴: ۲۹

اس نجات دہندہ کے لئے آرزو پیدا ہو جس کا وعدہ توریت اور صحف انبیاء[4] میں دیا گیا ہے اور وہ اس کی ضرورت اپنے لئے محسوس کریں۔(۳) یہ کہ غیر اقوام یہ معلوم کرکے کہ خدا نے بنی اسرائیل سے کیسا سلوک کیا اوران پر رحم وشفقت کے وسیلہ سے اپنی ذاتِ پاک کا کیسا اعلیٰ مکاشفہ عطا فرمایا اوراپنے عدل وقدس کو اور اپنی اخلاقی شریعت کو ظاہر کیا یہ سمجھ سکیں کہ ان کے بُت بالکل ہیچ ہیں اور بنی اسرائیل کا خداہی واحد وبرحق خدا اور زمین وآسمان کا خالق ومالک ہے تاکہ اس طرح سے غیر اقوام بھی اس کی عبادت کرنے کے لئے آرزومند ہوں اوراس نورونجات کا قبول کریں جو دنیا کا موعودہ نجات دہندہ جو پیشینگوئی کے مطابق داؤد کی نسل[5] سے بیت لحم[6] میں پیدا ہوگا ان کو بخشیگا۔

جن کتابوں کا ہم ذکر کرچکے ہیں۔ جن میں بنی اسرائیل کے ساتھ خدا کا سلوک توراً ایخاً مندرج ہے ان کے علاوہ اور بہت سی کتابیں ایسی ہیں جن میں خدا تعالیٰ کی مرضی کے متعلق ہدایات اور دعائیں اور حمد وثنا اوراس حق۔ سبحانہ وتعالیٰ کی شکر گزاری اور آئندہ واقعات کے متعلق بہت سی پیشینگوئیاں مندرج ہیں جن میں سے بہت سی پوری بھی ہوچکی ہیں۔ چنانچہ ایوب، زبور، امثال ، یسعیاہ ، یرمیاہ، حزقی ایل ، دانی ایل اور بارہ انبیایِ صغیر اسی قسم کی کتابیں ہیں۔ اگرچہ ہر ایک نبی کی کتاب اور تعلیم بالخصوص اسی کے وقت کے لوگوں کی تنبیہ اورہمت افزائی کے لئے تھی تو بھی وہ سب کے سب اپنی تعلیمات وپیشینگوئیوں کے وسیلہ سے اس موعودہ نجات دہندہ کی آمد کی تیاری کررہے

[4] یوحنا ۵: ۴۵تا ۴۷۔ لوقا ۲۴: ۲۵تا ۲۷

[5] یسعیاہ ۱۱: ۱تا ۱۰ یرمیاہ ۲۳: ۵

[6] میکاہ ۵: ۲

تھے۔ جس کے آنے کا الہیٰ اعلان حضرت ابراہیم واسحاق ویعقوب اور موسیٰ کے وسیلہ سے ہوچکا تھا۔ بنی اسرائیل میں جو لوگ پرہیزگار اور خدا ترس تھے وہ ان پیشینگوئیوں سے اس کی آمد کے وقت سے متعلقہ بڑے بڑے واقعات معلوم کرسکتے تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ کس مقام پر اور کس خاندان سے پیدا ہوگا۔ اس کی اخلاقی روش اور اس کی ذات کی الوہیت ، وہ کس قسم کے کام کریگا۔ بنی آدم کی خاطر کیا کیا دکھ اٹھائیگا۔ کیونکر مارا جائیگا اور قبر میں سڑنے نہیں پائیگا بلکہ پھر مردوں میں سے جی اٹھے گا۔ وہ نیز اس نجات کی حقیقت کو سمجھ سکتے تھے جو وہ بنی آدم کے سامنے پیش کرنے کو تھا۔

عہدِ عتیق کی کتبِ مقدسہ شروع سے آخر تک ذاتِ باری کی توحید کی تعلیم دیتی ہیں۔ یہودیوں کا عقیدہ کتابِ استثنا کے چھٹے باب کی چوتھی آیت میں یوں مرقوم ہے " سن لے اے اسرائیل ! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے"۔ یہ دینِ حق کا بنیادی پتھر ہے جیسا کہ سیدنا مسیح نے خود فرمایا ہے(مرقس ۱۲: ۲۹) لیکن اس لئے کہ یہ عظیم الشان حقیقت بنی آدم کے لئے فی الحقیقت فائدہ مند ہوسکے نہایت ضروری ہے کہ خداوند کریم اپنے تیئں کسی ایسے طور سے بنی آدم پر ظاہر کرے کہ وہ اسے جانیں اور عزیز رکھیں ورنہ توحیدِ الہیٰ پر محض ایمان لانے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ یہ ایسا ہی ہوگا جیسا کوئی آفتاب یا کسی اور بڑی حقیقت کی وحدت پر ایمان رکھے۔ ایسا ایمان نجات بخش نہیں ہے کیونکہ شیاطین خوب جانتے ہیں کہ خدا واحد ہے لیکن وہ نجات یافتہ نہیں ہیں (یعقوب ۲: ۹) کیونکہ وہ نہ خدا کو جانتے ہیں اور نہ اس سے محبت رکھتے ہیں۔ لہذا بنی اسرائیل کے انبیاء کی پیشینگوئیوں کے مطابق وقتِ معینہ پر وہ جو اکیلا ہی کلمتہ اللہ ہے (یوحنا ۱: ۱) وہ خدا کو ہم پر ظاہر کرنے کے لئے آیا تاکہ اس کے اپنے فرمان کے مطابق سچے ایمان دار ہمیشہ کی زندگی پائیں(یوحنا ۱۷: ۳)۔

جب مسیح موعود آیا تو زیادہ تر یہودیوں نے اسے قبول نہ کیا کیونکہ وہ دنیادار تھے اور گناہ سے نجات حاصل کرنے کی جگہ فقط رومی حکومت سے آزاد ہونے کے آرزومند تھے۔ ان کے دلوں میں حقیقی اقبالمندی اور خدا کے ساتھ صلح کرنے کی خواہش جوش زن نہ تھی بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ دنیا کے حاکم بنیں اوراہلِ روم اوراہلِ فارس کو لوٹ کر شادمان ہوں حالانکہ ان کی کتب مقدسہ میں نہایت صفائی اور صراحت کے ساتھ یہ تعلیم موجود تھی کہ مسیح موعود اپنی پہلی آمد کے وقت دنیوی قدرت اور شان وشوکت کے ساتھ نہیں آئیگا۔ لوگ اس کو حقیر جان کر رد کردینگے۔ وہ گلی کوچوں میں اپنی آواز سنانے کی کوشش نہیں کریگا بلکہ شکستہ دلوں کو تقویت دیگا اور شیطان کے قیدیوں کو گناہ کی غلامی سے آزاد کریگا۔ محض دنیا کی دوستی اور روحانی دینداری کی عدم موجودگی کے سبب سے ایسا ہوا کہ بہت سے یہودیوں نے سیدنا مسیح کو رد کردیا۔ لیکن جو ان میں سے روحانی مزاج کے تھے انہوں نے اس کو مصلوب ہونے سے پیشتر صعود فرمانے کے بعد قبول کرلیا اور غیر اقوام کے پاس نجات کا پیغام پہنچانے والے بنے۔

عہدِ جدید کو حواریوں اوران کے شاگردوں نے الہیٰ الہام کی مدد سے جس کا وعدہ خود سیدنا مسیح [1] نے کیا تھا قلمبند کیا۔ اناجیل میں مسیح کی تعلیم اور معجزات کا بیان مندرج ہے اوران سے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس میں کس طرح عہدِ عتیق کی بہت سی پیشینگوئیاں پوری ہوئیں۔ انہیں سے ہم کو راہِ نجات

---

[1] یوحنا ۱۴: ۲۵، ۲۶، ۱۶: ۱۳تا ۱۵

کی ہدایت ملتی ہے کیونکہ ان میں مرقوم ہے کہ سیدنا مسیح نے تمام جہان کے گناہوں کے کفارہ میں کس طرح اپنی جان دیدی اور مصلوب ہونے کے تین روز بعد کیونکر مردوں میں سے جی اٹھا اوراس کے چالیس روز بعد تک کس طرح اپنے آپ کو اپنے شاگردوں پر ظاہر کرتا اوران کو تعلیم دیتا رہا۔ اس نے ان کو تمام [1] اقوام کو انجیل سنانے کا حکم دیا اور ان کو روح القدس کے انعام کا وعدہ عطا فرمایا تاکہ وہ خدا سے طاقت پاکر دنیا کی حدود تک اس کے گواہ ہوں۔ اس نے ان کو حکم دیا کہ جب تک روح القدس ان پر نازل نہ ہو یروشلیم میں ٹھہرے رہیں۔ پھر آخر کار وہ ان کے سامنے آسمان پر صعود فرما گیا اوراپنی دوسری آمد کا وعدہ کرگیا۔ سیدنا مسیح کے بہت سے اقوال وافعال اس کی عین حیاعت ہی میں شاگردوں نے قلمبند کرلئے تھے۔ اس کے صعود مبارک کے بعد پہلے تو انہوں نے زبانی ہی خدا کی بادشاہی کی خوشخبری کی منادی کی۔ پھر یہ خوشخبری یا انجیل چار جداگانہ کتابوں میں لکھی گئی جو کہ انجیل متی ، انجیل مرقس، انجیل لوقا، اورانجیل یوحنا کہلاتی ہیں۔ یہ سب اناجیل سنہ عیسوی کی پہلی صدی کے اختتام سے پیشتر تحریر کی گئیں۔ان چاروں انجیل نویسوں میں سے متی اور یوحنا رسول یعنی حواریوں میں سے تھے۔ پطرس رسول کے شاگرد مرقس نے جو کچھ پطرس اور اوروں سے سنا سو لکھا۔ لہذا انجیل مرقس میں ایک تیسرے رسول کی گواہی موجود ہے۔ علاوہ بریں انجیل مرقس میں ایسی عبارات بھی مندرج ہیں جو سیدنا مسیح کے آسمان پر صعود فرمانے سے ضرور پیشتر لکھی گئی تھیں۔ لوقا پولوس رسول کا دوست اور شاگرد تھا۔ اس نے اپنی انجیل میں جو واقعات لکھے ہیں وہ بہت سے چشم دید[2] گواہوں کی شہادت سے لکھے گئے ۔ پطرس ویعقوب اور یہوداہ کے خطوط میں ایسے اصحاب کی شہادت موجود ہے جو سیدنا مسیح کے نہایت وفادار دوست اور شاگرد تھے۔اس کے عزیز ترین زمینی دوست یوحنا کے خطوط بھی موجود ہیں۔ پولوس رسول کے خطوط (جن میں سے قدیم ترین ۱ ، ۲ تھسلنیکیوں کو ہیں) ۔صعود مسیح سے بائیس یا تئیس سال بعد لکھے گئے تھے اورہم کو سیدنا مسیح کے وسیلہ سے راہِ نجات کی رہنمائی کرتے ہیں اور مسیحیوں پر فرض ٹھہراتے ہیں تاکہ اپنے مقدس نام کے لائق چال چلیں اور اس طرح سے خدا کی خوشنودی حاصل کریں ۔ قدیم مسیحیوں کے عقیدہ کا ایک حصہ پولوس رسول کے ایک خط میں مندرج ہے۔ چنانچہ ۱ ۔ کرنتھیوں ۵: ۳، ۴ میں یوں مرقوم ہے کہ " مسیح کتابِ مقدس کے بموجب ہمارے گناہوں کے لئے موا اور دفن ہوا اور تیسرے دن کتابِ مقدس کے بموجب جی اٹھا"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نہایت قدیم زمانہ کے مسیحی عہدِ عتیق وجدید کا خلاصہ اس کفارہ کو مانتے تھے جو سیدنا مسیح نے جہان کے گناہوں کے لئے دیا اور جس کے موثر کارگر ہونے کی دلیل اس کے جی اٹھنے سے ملتی ہے۔ عہدِ جدید کی دیگر کتب میں کتابِ اعمال الرسل سے ہم کو یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ سیدنا مسیح کے صعود فرمانے کے سات روز بعد روح القدس (پراقلیط[3]) نازل [4]ہوا اور کس طرح سے غیر اقوام کو انجیل سنانے کا کام شروع ہوا۔ عبرانیوں کا خط سیدنا مسیح کی انجیل اور موسوی شریعت کے باہمی رشتہ کی تشریح کرتا ہے۔ یوحنا کا مکاشفہ

---

[1]متی ۲۸: ۱۸تا ۲۰ اعمال الرسل ۱: ۸

اعمال الرسل ۱: ۴، ۵- یوحنا ۱۴: ۳- اعمال الرسل ۱: ۹تا ۱۱

[2]لوقا ۱: ۱تا ۴

[3]یوحنا ۱۶: ۷۔

[4]اعمال الرسل دوسرا باب

پیشینگوئی کے طور پر کلیسیا اور دنیا کی باہمی کشمکش اور آخر کار نیکی کے بدی پر غالب آنے کا بیان کرتا ہے (مکاشفہ کا نواں باب اہل اسلام کے لئے خاص طور سے قابل غور ہے)۔ اس کتاب میں مرقوم ہے کہ شیطان اذیتوں اور آزمائیشوں کے وسیلہ سے بنی آدم کو سیدنا مسیح سے جدا کرنے کی کوشش کریگا اور دجال لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے ظاہر ہوگا اور سچے مسیحی ایمان ہی کے وسیلہ سے نجات پا کر مصیبتوں کی بھٹی سے ایسے پاک وصاف ہو کر نکلینگے جیسے سونا کٹھالی سے نکلتا ہے اور آخر کار سیدنا مسیح نہایت قدرت وجلال کے ساتھ آسمان سے اتریں گے تاکہ نئے آسمان اور نئی زمین میں اپنی ابدی سلطنت قائم کریں جس میں " کوئی ناپاک چیز یا کوئی شخص جو گھنونے کام کرتا یا جھوٹی باتیں گھڑتا ہے ہرگز داخل نہ ہوگا مگر وہی جن کے نام برے کی کتابِ حیات میں لکھے ہوئے ہیں" (مکاشفہ ۲۱: ۲۷)۔

یہ تمام کتبِ عہد جدید، عہدِ عتیق کے ساتھ متفق ہو کر بتاتی ہیں کہ وہ راہِ نجات جس سے تمام اقوام برکت پائینگی (پیدائش ۲۸: ۱۴) اس موعود پر ایمان لانے سے ملتی ہے جو کہ عورت کی نسل سے ہے(پیدائش ۳: ۱۵)جو کنواری مریم سے پیدا ہوا (لوقا ۱: ۲۶تا ۳۸[1])تاکہ اپنے لوگوں کو ان کے گناہوں سے بچائے۔(متی ۱: ۲۱) جس نے اپنی جان بہتوں کے لئے کفارہ میں دی (یسعیاہ ۵۳: ۱۱۔ متی ۲۰: ۲۸) جو ہم کو راستباز ٹھہرانے کے لئے مُردوں میں سے جی اٹھا (زبور ۱۶: ۹تا ۱۱ واعمال الرسل ۲: ۲۲تا ۳۶ورومی ۴: ۲۵)اور فقط اسی کے وسیلہ سے انسان اللہ تعالیٰ کا

[1]سورۃ التحریم آخری آیت۔

حقیقی عرفان حاصل کرسکتا ہے (یوحنا ۱۴: ۶) اور ابدی نجات کا وارث بن سکتا ہے (اعمال ۴: ۱۲)۔ پس ہم صاف دیکھتے ہیں کہ کس طرح وہ وعدے جو ہزارہا سال پیشتر اللہ جل شانہ نے آدم وابراہیم واسحاق ویعقوب اور داؤد سے کئے تھے پورے ہوئے اور کس طرح انسان اس نجات دہندہ کی مدد سے گناہ وشیطان کی غلامی وحلقہ بگوشی سے آزاد ہوسکتا ہے اور کس طرح سے زمین پر ایسی کمال اور خوشی کی حالت قائم ہوسکتی ہے جیسی کہ آدم کے گناہ کرنے سے پہلے بھی نہ تھی۔

اب اس کتاب کے معزز پڑھنے والے خوب سمجھ سکتے ہیں کہ عہدِ عتیق وجدید بہیئت مجموعی اللہ جل شانہ کا واحد مکاشفہ ہیں۔ عہدِ عتیق بتاتا ہے کہ بنی آدم کس طرح سے گناہ میں مبتلا ہوگئے اور کس طرح سے خدا نے گناہ سے بچانے والے نجات دہندہ کا وعدہ بخشا۔ عہدِ جدید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وعدہ کیونکر پورا ہوا۔ سیدنا مسیح نے کس طرح تمام جہان کے گناہوں کا کفارہ دیا(۱۔یوحنا ۲: ۲) اور ان سب کو جو صدقِ دل سے اس کی طرف رجوع لاتے ہیں نجات بخشتا ہے(متی ۱۱: ۲۸ویوحنا ۶: ۳۷)

انبیاءورسل کے بارے میں ہم مسیحیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ ایسے انسان تھے جن کو خدا نے خاص طور سے بنی آدم کی ہدایت ورہبری کے لئے بھیجا۔ وہ لوگوں پر حکومت کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس غرض سے بھیجے گئے تھے کہ ان کو متنبہ کریں تاکہ وہ اپنے گناہوں سے دست بردار ہو کر خدا کی عبادت کریں۔ انبیاء ورسل بے گناہ نہیں تھے کیونکہ روئے زمین پر سیدنا مسیح ہی ایک بے گناہ انسان ہوا ہے اور اسکی بے گناہی ومعصومیت پر انبیاء کی شہادت موجود ہے (یسعیاہ ۵۳: ۹۔ یوحنا ۸: ۴۶) ۔ اس کے اپنے شاگردوں کی

شہادت (۱ پطرس ۲: ۲۲، ۱ یوحنا ۳: ۵ عبرانیوں ۴: ۱۵)۔ اس کو مصلوب کرنے والے بھی اس کی بے گناہی پر گواہی دیتے ہیں(لوقا ۲۳: ۴، ۱۴: ۴۷)۔ قرآن دیگر انبیاء کے گناہ[1] بیان کرتا ہے لیکن سیدنا مسیح سے کوئی گناہ منسوب نہیں کرتا اوراسلامی احادیث بھی اس امر[2] پر متفق ہیں۔ لیکن الہیٰ پیغام کے پہنچانے میں انبیاء ورسل کو روح القدس نے غلط تعلیم دینے اور نجات کے لئے کسی ضروری تعلیم کے کسی حصہ کو فروگذاشت کرنے سے محفوظ رکھا(متی ۱۰: ۲۰، مرقس ۱۳: ۱۱، یوحنا ۱۴: ۲۶، ۲ تمیتھیس ۲: ۱۶، ۲ پطرس ۱: ۲۱) ہم مسیحی اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ کتبِ بائبل کے لکھنے والوں کو الہام کی برکت ملی۔ لیکن ہم یہ نہیں مانتے کہ توریت وانجیل پیدائش عالم سے ہزارہا سال پیشتر آسمان پر لکھی گئیں اور بعد میں لفظ بلفظ انبیاء ورسل کو سنائی گئیں اورپھر انہوں نے خود لکھا یا لکھوایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح سے فقط ان ملہموں کے ہاتھوں اور زبانوں ہی کو استعمال نہیں کیا بلکہ جو دانائی اور تعلیم وتربیت اس نے ان کو بخشی تھی اس کو بھی کام میں لایا۔ اپنی تعلیمات کو انبیاء ورسل کے وسیلہ سے بنی آدم تک پہنچانے میں اللہ جل شانہ نے ان کو تجربہ وعلم اور دل ودماغ اور جسم وجان سے بھی کام لیا۔ لہذا کتب مقدسہ میں انسانی والہیٰ دونوں اجزا پائے جاتے ہیں۔

بائبل میں چند ایسی تعلیمات بھی موجود ہیں جو ہماری محدود انسانی عقل میں نہیں آسکتیں۔ لہذا بعض لوگ اس وہم میں پڑجاتے ہیں کہ یہ خلافِ عقل ہیں لیکن درحقیقت وہ خلافِ عقل نہیں ہیں۔ چونکہ ہماری عقل الہیٰ بخشش ہے اس لئے اس کا سچا الہام ومکاشفہ اس کا خلاف نہیں ہوسکتا۔ لیکن چونکہ ہماری عقل محدود ہے اس لئے اس سے یہ امید رکھنا کہ وہ خدا کی لامحدودوذات کو پورے طور سے سمجھے اور اس پر حاوی ہو بالکل نامناسب ہے۔ اگر بائبل یا کوئی اور کتاب جو من جانب اللہ ہونے کا دعویٰ کرتی ہو اللہ جل جلالہ کا ایسا بیان کرے کہ ہر شخص اس ذاتِ باری کی ہستی کی حقیقت کو کامل طور سے کماحقہ سمجھ سکے تو اس سے فوراً یہ صاف وصریح نتیجہ نکلیگا کہ وہ کتاب خدایِ لامحدود کی طرف سے ہونے کے دعویٰ میں بالکل کاذب ہے۔ اگلے باب میں جب ہم اس مضمون پر غور کرینگے کہ ذات وصفات ایزدی کے بارے میں ہم پر کیا منکشف کیا گیا ہے توان باتوں کا یادرکھنا بہت مفید ثابت ہوگا۔

---

[1] دیکھو سورۃ ۲۰ آیت ۱۱۹ - سورۃ ۲ آیت ۳۳ تا ۳۴- سورۃ ۷۰ آیت ۲۹ - سورہ ۶ آیت ۷۶، ۷۷، ۷۸ - سورۃ ۱۴ آیت ۴۲- سورۃ ۴۸ آیت ۱۴، ۱۵ - سورۃ ۲۶ آیت ۱۹ - سورۃ آیت ۱۵۰ - سورۃ ۱۳ آیت ۲۴- سورۃ ۳۸ آیت ۳۳، ۱۴، ۳۴- سورۃ ۳۷ آیت ۱۳۹ سے ۱۴۴ تک وغیرہ وغیرہ۔ اہلِ اسلام حضرت آدم ونوح وابراہیم کو نبی مانتے ہیں۔

[2] دیکھو مشکواۃ المصابیح جلد اول باب اول فصل سوم اور پچیسواں باب فصل اول۔

دوسرا باب

اللہ تعالیٰ کی صفات جیسی کہ بائبل میں ان کی تعلیم دی گئی ہے

عہدِ عتیق وجدید کی کتبِ مقدسہ صاف بیان کرتی ہیں کہ خدا کی ہستی اس کی مخلوق کائنات کی ہستی ہی سے عیاں ہے اور انسانی ضمیر وعقل بھی اپنے الہیٰ خالق پردلالت کرتی ہیں(زبور ۱۹: ۱تا ۴۔ اعمال الرسل ۱۷: ۲۴تا ۲۹)۔ چونکہ واجب الوجود کی ہستی ایسی بدیہی ہے اس لئے کتبِ مقدسہ میں مرقوم ہے کہ خدا کی ہستی سے انکار جہالت بالعمداور احمقانہ شرارت کا نتیجہ ہے۔(زبور ۱۴: ۱، ۵۳، اور رومی ۱: ۱۹-۲۳) بائبل ہم کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ خدا ایک ہے(استشنا ۴: ۳۵، ۳۹اور ۶: ۴، یسعیاہ ۴۴: ۸، ۴۵: ۵، ۴۶: ۹ مرقس ۱۲: ۲۹ ویوحنا ۱۷: ۳۔ ۱کرنتھیوں ۸: ۴، افسیوں ۴: ۶) اور یہ کہ خداروح ہے(یوحنا ۴: ۲۴) اور نادیدنی ہے (یوحنا ۱: ۱۸، ۱تمیتھیس ۶: ۱۵، ۱۶) اور یہ کہ وہ لامحدود اور ازلی وابدی ولاتبدیل (زبور ۹۰: ۲۔ ۱۰۲: ۲۴، ۲۷۔ یعقوب ۱: ۱۷) اور حاضر وناظر عالم الغیب (زبور ۱۳۹: ۱-۱۲۔ یرمیاہ ۲۳: ۲۳، ۲۴، اعمال الرسل ۱۷: ۲۷، ۲۸) اور قادر مطلق اور دانایِ کل ہے(پیدائش ۱۷: ، ایوب ۱۲: ۷-۱۰، ۱۳، زبور ۱۰۴: ۲۴۔ ویسعیاہ ۴۰: ۱۲تا ۱۸-و۱یوحنا۳: ۲۰)۔

اسی طرح سے خدایِ ذوالجلال قدوس بیان کیا گیا ہے(مکاشفہ ۱۹: ۲، ۲۱: ۸۔ پہلاسیموئیل ۲: ۲ وزبور ۲۲: ۳، ۱۴۵: ۱۷ یسعیاہ ۶: ۳ مکاشفہ ۴: ۸) اور نیز وہ عادل راستباز (گنتی ۲۳: ۱۹، استشنا ۳۲: ۴وزبور ۳۳: ۴، ۵ یسعیاہ ۲۶: ۷، ۴۵: ۲۱ ورومیوں ۲: ۵، ۱۱- ۱یوحنا ۱: ۹(مکاشفہ ۱۵: ۳، ۱۶: ۵تا ۷)۔ اور رحیم ورحمان وحلیم(خروج ۳۴: ۶ زبور ۹: ۸تا ۱۰، ونوحہ ۳: ۲۲، ۲۳۔ وحزقی ایل ۳۳: ۱۱، متی ۵: ۴۵، یوحنا ۳: ۱۶- ۱یوحنا ۴: ۱۶)۔ اور خالق اور اپنی تمام مخلوقات کا محافظ ونگہبان ہے(پیدائش ۱: ۱، ۱سیموئیل ۲: ۷، زبور ۳۳: ۶، ۳۷: ۲۵-۳۳، ۱۰۴- متی ۶: ۳۱، ۳۲، ۱۰: ۲۹-۳۱- رومیوں ۱۱: ۳۶ مکاشفہ ۴: ۱۱)۔

یہ ان بہت سی عالیشان صفات میں سے بائبل خدایِ واحد وبرحق سے منسوب کرتی ہے فقط تھوڑی سی ہیں۔ باقی تمام صفات اس جملہ میں جمع ہیں کہ وہ حق سبحانہ وتعالیٰ اپنی ذات۔ اپنے علم، اپنی تعلیمات اور اپنے افعال میں کامل ہے(استشنا ۳۲: ۴، ۲سموئیل ۲۲: ۳۱- ایوب ۳۶: ۴، ۳۷: ۱۶وزبور ۱۸: ۳۰، ۱۹: ۷، متی ۵: ۴۸)۔

پس اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ تمام بیانات جو خدا اوراس کی عالیشان صفات کے بارے میں بائبل میں مرقوم ہیں ایسے ہیں کہ ان کو سن کر ہم اپنی عقل وضمیر سے ان کی تائید وتصدیق کرتے ہیں کیونکہ وہ نہایت رحیم ورحمان خالق کون ومکان کی شان کے شایاں ہیں اور الہیٰ الہام وہدایت کے بغیر خدا کا ایسا عرفان بنی آدم کسی طرح سے حاصل بھی نہیں کرسکتے تھے۔ اگر ہم قدیم زمانہ کے سب سے دانا وعالم فلاسفروں کی تصانیف کو دیکھیں تو افلاطون وارسطو

کی تصانیف سے بھی یہی ظاہر ہوگا کہ ان داناؤں نے بھی ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں کبھی ایسی تعلیم نہیں دی جیسی کہ بائبل میں مندرج ہے۔ ان داناؤں نے خدایِ ذوالجلال کی توحید و شخصیت اور قدسیت کے بارے میں کوئی صاف تعلیم نہیں دی۔ قدس ذات حق سبحانہ وتعالیٰ کے باب میں بائبل کی تعلیم نئے اور پرانے تمام مذاہب کی تعلیمات سے مختلف ہے۔

جب وہ لوگ جو فی الحقیقت پرہیزگار اور عرفانِ الہیٰ کے آرزومند اور خدا کی مرضی کو بجالانے کے مشتاق ہیں دعا ومناجات کے ساتھ بائبل کو مطالعہ کرتے ہیں تب کلام اللہ ان کے دلوں میں داخل ہوکر ان کو روحانی نور بخشتا ہے(زبور ۱۱۹: ۱۰۵، ۱۳۰) اوران کو خدا تک پہنچنے (استثنا ۴: ۲۹، یرمیاہ ۲۹: ۱۳، یوحنا۷: ۱۷)۔اوراس کی مرضی دریافت کرنے اور پہچاننے کی توفیق بخشتا ہے۔ روح القدس کی قدرت ان کے دلوں میں خدا کے خوف اور محبت کو پیدا کرتی ہے اور(رومیوں ۴: ۵) اوران کو اپنے خالق کی فرمانبرداری کے لئے فضل عطا ہوتا ہے۔ ان کے دل بدل جاتے ہیں اوران کو نئی روحانی پیدائش حاصل ہوتی ہے(یوحنا ۱: ۱۲، ۱۳، اور ۳: ۵، ۶) اور سیدنا مسیح پر ایمان لانے کے وسیلہ سے وہ نئے مخلوق بن جاتے ہیں (۲ کرنتھیوں ۵: ۱۷)۔ وہ گناہ سے نفرت اور نیکوکاری سے محبت رکھنا سیکھتے ہیں۔ وہ بدی سے بھاگتے اور نیکی ودینداری سے لپٹے رہتے ہیں کیونکہ کتب مقدسہ ہم کو یہ تعلیم دیتی ہیں کہ خدا پاک وعادل ہے اور جو لوگ فرعون کی طرح اس کے خلاف اپنے دلوں کو سخت کرتے ہیں کہ ان کو سزا دے سکتا ہے لیکن جو لوگ اپنے گناہوں سے فی الحقیقت تائب ہوکر اس کی خدمت میں نئی زندگی بسر کرنے کی آرزواور کوشش کرتے ہیں ان کے لئے نہایت شفیق ومہربان اور پراز محبت باپ ہے۔ پس بائبل کے جن چند مقامات کا ہم نے اس باب میں ذکر کیا ہے اگر کوئی حق جوان کو دعا ومناجات کے ساتھ پڑھے تو وہ یہ بات محسوس کرنے لگیگا کہ کتب مقدسہ میں حقیقی اور سچے الہام کی تمام شرائط موجود ہیں۔ اس کتاب کے باقی ابواب سے یہ امر انشاء اللہ تعالیٰ اور بھی روشن ہوجائیگا۔

عہد جدید سے ہم کو یہ تعلیم ملتی ہے کہ حقیقی عرفانِ الہیٰ فقط روح القدس کے سکھلانے سے حاصل ہوسکتا ہے جو ہمیشہ ہماری مدد ویاری کے لئے تیار ہے۔ خدا کا کامل مکاشفہ ہم کو سیدنا مسیح میں بخشا گیا ہے چنانچہ وہ خود فرماتاہے" جس نے مجھے دیکھا اس نے باپ کو دیکھا"(یوحنا ۱۴: ۹)۔ اور یہ الہیٰ مکاشفہ فقط سیدنا مسیح ہی میں بخشا گیاہے۔ کیونکہ وہی اکیلا کلمتہ اللہ ہے۔

تیسرا باب

انسان کی قدیم حالت اوراس کا موجودہ تباہ حال اوراسے گناہ وابدی ہلاکت سے نجات کی ضرورت

اگر کوئی شخص یہ جاننے کا آرزومند ہو کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی نظر میں اس کی کیا حالت ہے تووہ کسی قدر اپنے ضمیر سے اور زیادہ ترکلام اللہ سے دریافت کرسکتا ہے۔خدا سب کچھ جانتا ہے اور اس سے کوئی راز پوشیدہ نہیں ہے" اس سے مخلوقات کی کوئی چیز چھپی نہیں بلکہ جس سے ہم کو کام ہے اس کی نظروں میں سب چیزیں کھلی اور بے پردہ ہیں"(عبرانیوں ۴: ۱۳) ۔وہ فقط وہی باتیں نہیں جانتا جو ہم نے کی ہیں بلکہ جو کچھ ہم نے عمر بھر سوچا وہ سب کچھ اسے معلوم ہے۔ فقط خدا ہی ہم کو بتاسکتا ہے کہ اس نے کس مقصد سے ہم کو پیدا کیا اورآج تک زندہ رکھا ہے اور ہماری آئندہ بہتری اور خوشوقتی کے حصول کادارمدار کس بات پر ہے۔ فلاسفروں نے اپنی تصانیف میں ان مضامین پر اپنے خیالات بیان کئے ہیں لیکن ہماری عقل ہم کو اس امر کا یقین دلاتی ہے کہ اگر خدا نے اپنی پاک مرضی کو انبیاورسل کے وسیلہ سے ظاہر فرمایا ہے توجو کچھ تعلیم ہم کو کلام اللہ میں دی جاتی ہے وہ ضرور انسانی استدلال سے کہیں بڑھ کر اعتماد وثوق کے لائق ہے۔ پس انسان کی پیدائش سے خدا کے پُراز شفقت ارادہ کو جاننے اور یہ دریافت کرنے کے لئے کہ بنی آدم اپنی موجودہ گناہ وبدحالی کی حالت میں کیسے مبتلا ہوگئے کتبِ مقدسہ کو مطالعہ کرنا چاہیے۔ لہذا ان اوراق کا مصنف نہایت ادب سے التماس کرتا ہے کہ معزز ناظرین تمام تعصب سے کنارہ کرکے کتب توریت وزبور اورانجیل کو پڑھیں جن کے حق میں قرآن کی عظیم شہادت موجود ہے۔ مناسب ہے کہ کلام اللہ کا مطالعہ ادب وانکسار ودلی سرگرمی کے ساتھ کریں اور یہ دعا کریں کہ خدائِ ذوالجلال جو نہایت رحیم ورحمان ہے کہ ہم کو روحانی بینائی اور ہدایت عنایت فرمائے تاکہ ہم اس کے کلام کا ٹھیک مطلب سمجھیں اور ہماری عقل کی آنکھیں کھول دے تاکہ ہم اپنی اندرونی حالت کو جانیں اور ابدی نجات وہمیشہ کی زندگی اور دائمی سعادتمندی وفرخندہ فالی کی راہ کوپہچان کرحاصل کریں۔

اگرہم کتابِ پیدائش کے پہلے باب کی ۲۶ویں آیت سے دوسرے باب کی ۵ ہویں آیت تک بغور مطالعہ کریں توہم کو صاف معلوم ہوجائے گا کہ اللہ جل شانہ نے انسان کو پاک وصاف اور سعادت ونیک بختی کی حالت میں پیدا کیا تھا۔ یہ جملہ کہ" خدا نے انسان کو اپنی صورت پر اپنی مانند پیدا کیا"۔ یہ معنی رکھتا ہے کہ محدود مخلوق انسان اوراس کے لامحدود خالق کے درمیان ابتدا میں عقلی اور خصوصاً روحانی مشابہت اس قدر تھی کہ کسی حد تک خالق اپنے آپ کو مخلوقِ انسان پرظاہر کرسکتا تھا۔ اس وقت انسان بیشک گناہ وبد خیالات وخواہشات سے بری تھا اورجسمانی وروحانی ہر طرح کی کمزوری سے خالی تھا اوراس کی ذات میں بیماری اوردکھ کی موت کا مطلق امکان نہ تھا۔ چونکہ اس وقت انسان خدا کو جانتا اوردوست رکھتا تھا اوراس کی خدمت وعبادت کا آرزومند تھا اس لئے وہ نہایت شادمان اوراپنی حالت میں خوش وفرحان تھا۔ علاوہ بریں اس وقت جس قدر مخلوقات رویِ زمین پر موجود تھی اس سب کا سردار انسان ہی تھا۔ کتابِ پیدائش سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے انسان کی بدوو باش

کی غرض سے ایک خاص جگہ تیار کی۔ یہ جگہ عدن میں تھی (پیدائش ۲: ۸)۔ عدن اس بڑے میدان کا نام تھا جس میں بہت سے زمانے گذرنے کے بعد بابل اور دیگر بڑے بڑے شہر تعمیر کئے گئے۔

ہر ایک انسان کا ضمیر اس حقیقت پر گواہی دیتا ہے کہ بنی آدم اس ابتدائی بیگناہی اور فرخندہ فالی میں قائم نہیں رہے۔ علاوہ برین ان قدیم اقوام کی تواریخ جو اپنی شرارت وبدکاری کے سبب سے تباہ ہوگئیں اور گناہ ورنج والم کا وجود ایسی بین حقیقتیں ہیں جن سے اس امر کا کافی ووافی ثبوت ملتا ہے کہ ہماری حالت بہت بدل گئی ہے اور موجودہ حالت ہر گز ہر گز وہ حالت نہیں ہے جس میں اللہ جل شانہ نے آدم کو پیدا کیا تھا اور جس میں اس رحیم ورحمان کی مرضی تھی کہ آدم اور بنی آدم قائم رہیں۔ اس کے علاوہ اور شہادت بھی موجودہ حالت خدا کی نظر میں نہایت ہی گناہ آلودہ اور ناگفتہ بہ ہے (پیدائش ۸: ۲۱، زبور ۱۴۳: ۲، رومیوں ۳: ۱۰- ۲۰، ۲۳- ۱ یوحنا ۱: ۸)۔

جو کوئی اپنے دل سے ذرا بھی واقفیت رکھتا ہے اور ان خیالات وخواہشات کو جانتا ہے جو اکثر دل میں پیدا ہوتی رہتی ہیں اور چشمہ کے پانی کی طرح جوش مارتی ہیں وہ ضرور تسلیم کریگا کہ وہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی نظر میں ایسا ہی گنہگار وخطاکار ہے جیسا کہ مندرجہ بالاآیات بیان کرتی ہیں۔ ضمیر اسے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ گناہ اور ناپاکی اس کے دل پر قابض ہیں اور وہ بُری خواہشات وشہوات سے ایسا معمور رہا ہے کہ عہدِ طفولیت ہی سے وہ بدی کی طرف مائل ہے اور اسی سبب سے اخلاقی طور پر ہمیشہ اس کی طبیعت گناہ آلودہ رہی ہے۔ تمام بنی آدم ایک ہی قسم کے گناہ کی طرف مائل وراغب نہیں ہیں ۔ بعض بڑے بڑے خیال باندھنے والے ہیں۔ بعض حریص، بعض شہوت پرست ، بعض بے رحم، بعض مغرور اور متکبر اور بعض سر دمہر وبیوفا ہیں۔ بعض ریاکار، بعض بے ایمان وکم اعتقاد اور بعض ان گناہوں میں سے کئی ایک کی طرف مائل ہیں لیکن تجربہ ہم کو یہ سیکھاتا ہے کہ کوئی انسان بھی گناہ سے خالی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ نیک سے نیک لوگ بھی اس امر کے معترف ہیں کہ بہت سے ایسے کام جن سے ان کو پرہیز کرنا چاہیے تھا ان سے سرزد ہوئے ہیں اور بہت سے ایسے کام جو کرنے کے تھے انہوں نے نہیں کئے ۔ پس تمام بنی آدم کی گذشتہ اور موجودہ حالت سے نہایت صفائی اور صراحت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ بائبل کلام اللہ ہے۔ بہت سے بے دین لوگوں نے بھی اسے سن کر یہ محسوس کیا ہے کہ ضرور اس میں خدا کا پیغام مندرج ہے ۔ اسی لئے بہت سے ایسے لوگوں نے یہ کہکر کہ " جس نے یہ کتاب بنائی ہے وہی میرا خالق ہے" مسیحی تعلیم کی آرزو کی ہے۔

بعض لوگوں نے دل کی تبدیلی حاصل کرکے گناہ سے نفرت اور نیکوکاری سے محبت رکھنا شروع کیا ہے ۔ اس تبدیلی کا سبب وہ نئی پیدائش ہے جس کا سیدنا مسیح نے یوحنا ۳:۳تا ۵ میں ذکر کیا ہے اور یہ تبدیلی فقط ان کو حاصل ہوتی ہے جو صدقِ دل سے اس پر ایمان لاتے ہیں۔

ہم کتبِ مقدسہ کی تعلیم سے دریافت کرچکے ہیں کہ جب خدا نے آدم کو پیدا کیا وہ گناہ کی طرف مائل نہ تھا اور اس لئے وہ اس گنہگاری اور تباہی کی حالت میں نہ تھا جس میں اس کی اولاد پائی جاتی ہے ۔ ہماری عقل بھی ہم کو صاف بتاتی ہے کہ ارتکابِ معاصی خدا کی پاک مرضی کے خلاف ہے کیونکہ گناہ اخلاقی شریعت کی خلاف ورزی کا نام ہے جو ذات باری تعالیٰ کے مطابق وموافق اور اس کا اظہار ہے ۔ لہذا یہ کہنا کہ خدا اپنی مرضی کی خلاف ورزی چاہتا ہے اپنی

آپ ہی تکذیب کرنا ہے۔ چونکہ اب بنی آدم گناہ اور تباہی کے ورطہ میں غوطے کھارہے ہیں اور نفسِ امارہ کی غلامی میں گرفتار ہیں یہ دریافت کرنا نہایت مناسب بلکہ انسب ہے کہ بنی آدم اس بدکاری وبربادی میں کیونکر مبتلاہوگئے۔

کتبِ مقدسہ اس سوال کا جواب دیتی اورہم کو صاف بتلاتی ہیں کہ گناہ اور گناہ کے بد نتائج میں انسان شیطان کی عداوت اور فریب دہی سے اور خدایِ تعالیٰ کی پاک مرضی کی جگہ اپنی مرضی پر اپنے آزادانہ فیصلہ سے عمل کرنے کےسبب سے گرفتار ہوا ۔ حوا نے شیطان سے فریب کھایا اوراس نے آدم کو گمراہ کیا۔ آدم نے جان بوجھ کر قصداً خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی اور اس طرح وہ خیالات واعمال میں حق کی دوستی سے جدا اور چشمہ حیات وحقیقی فرخندہ حالی سے دور ہوگیا۔ یہ تمام بیان کتابِ پیدائش کے تیسرے باپ میں مندرج ہے۔ علاوہ بریں یوحنا ۸: ۴۴ ورومیوں ۵: ۱۲، ۱۹ اورپہلا تمیتھیس ۲: ۱۳، ۱۴ بھی ملاحظہ کیجئے۔

اس مقام پر اگر کوئی یہ سوال کرے کہ خدا نے جہان میں بدی کو داخل ہونے سے نہ روکا؟ اس نے ابلیس کوآدم کو ورغلانے اوراس پر غالب آنے کی کیوں اجازت دی؟ وہ تاحال شیطان کو کیوں اجازت دیتا ہے کہ گناہ وبربادی اورجدائی وظلم وستم کو زمین پر قائم رکھے ؟ تو اس کا جواب اس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ طریق الحیٰوۃ میں ملے گا۔ ہم یہاں پر فقط یہ کہتے ہیں کہ خدا نے ہمارے لئے اس امر کی تشریح نہیں کی اور انسانی عقل وادراک کو کوئی بالکل تسلی بخش اور قابل اطمینان جواب نہیں سوجھا۔ اس معاملہ میں خواہ ہم خدا کے طرزِ عمل کو جاننے کے کتنے ہی آرزومند ہوں توبھی جو کچھ وہ کرتاہے ہم کو اسی دنیا میں دریافت کرنا اورجاننا ضروری نہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی گم گشتگی وتباہ حالی کو پہچانیں اوراس سے خلاصی اور رہائی کی راہ کو دریافت کریں اورجانیں۔ ہم حضرت ابراہیم کی طرح یہ جانتے ہیں کہ تمام جہان کا انصاف کرنے والا جو کچھ کرتا ہے بالکل راست وبجا ہے۔(پیدائش ۲۸: ۲۵)

دانایانِ روزگار نے ہم کو اس امر کا یقین دلادیا ہے کہ اس دنیا میں ایسی بہت سی آزمائیشوں کا وجود اور یہ حقیقت کہ دنیا میں اس قدر تکالیف اوردکھ درد جو گناہ کے سبب سے موجود ہیں ہم کو بفضلِ خدا آزمائشوں سے لڑنے اوران پر غالب آنے کے وسیلہ سے اور گناہ کے ہولناک نتائج کو دکھا کر نیکی کرنے میں تعلیم وتربیت کرتے ہیں اورہماری زندگی کو نہایت عجیب طور سے اس دنیا میں تربیت پذیر بناتے ہیں ۔ خدا نے بنی آدم کوآزاد مرضی عنایت کی ہے چنانچہ وہ مختار ہیں کہ وہ اپنے لئے نیکی یا بدی ۔ گناہ یا راستبازی ، فرمانبرداری یا نافرمانی شیطان کی غلامی سے آزادی یا اسکی اطاعت جو چاہیں اختیار کریں۔ خدا نے اپنی مرضی اوراپنی محبت کو ہم پر ظاہر فرمادیا ہے ۔ اس نے راہِ راست کی ہدایت تو کردی ہے لیکن وہ ہم کو اپنی طرف رجوع کرنے کے لئے مجبور نہیں کرتا کیونکہ وہ ہماری محبت چاہتا ہے اور محبت میں جیسا کہ سچے دین میں جبر مطلق نہیں ہے۔خدایِ رحمٰن نے لاریب ہم کو اپنے کلامِ پاک میں یہ تعلیم دی ہے اور صاف بتادیا ہے کہ ہر گز ہر گز اس کی یہ مرضی نہیں کہ بنی آدم سے کوئی بھی گناہ وشیطان کی غلامی میں رہے۔[1] خدا تو یہ چاہتا ہے کہ ہر ایک انسان گناہ کی قید سے آزاد ہو۔ عصیان وناپاکی کے دھبوں سے پاک وصاف ہو اور خدا کے ساتھ وہ روحانی مشابہت جو آدم کھوبیٹھا حاصل کرے تاکہ ہر ایک انسان ابدی مبارک بادی

[1] حزقی ایل ۱۸: ۲۳، ۳۲، ۳۳-۱ یوحنا ۳: ۱۶- ۲ پطرس ۳: ۹

وسعادتمندی کا وارث ہو۔ عہدِ عتیق وجدید انسان کے عالمگیر تجربہ کے ساتھ متفق ہو کر یہ تعلیم دیتے ہیں کہ جب تک انسان اپنے بد افعال سے تائب ہو کر سچے ایمان کے ساتھ خدا کی طرف رجوع نہیں لاتا اور گناہ سے آزاد ہو کر اللہ جل شانہ سے معافی ومغفرت حاصل نہیں کرتا تب تک اس کے لئے سچی خوشی اور حقیقی نیک بختی ناممکن ہے۔ دل کی پاکیزگی کے بغیر کوئی آدمی کبھی اپنی اندرونی آنکھ سے خدا کو نہیں دیکھ سکتا (متی ۵: ۸، عبرانیوں ۱۲: ۱۴) ۔ حقیقی دیندار انسان کے لئے پاک ہونا ضرور ہے کیونکہ حق سبحانہ وتعالیٰ پاک ہے (احبار ۱۹: ۲، متی ۵: ۴۸، ۲ کرنتھیوں ۶: ۱۴سے ۷: ۱تک و ۱ پطرس ۲: ۹، ۱۰ ۱ یوحنا ۳: ۱ - ۸) یہ کتبِ مقدسہ کی تعلیم ہے اورجب ہم اس تعلیم کو سیکھتے ہیں تو ہماری عقل اور ضمیر سے بھی اس کی صداقت پر شہادت ملتی ہے ۔ کیونکہ انسان خدا کی صورت پر پیدا کیا گیا تھا اورچونکہ اس صورت کو گناہ سے خراب کر بیٹھا ہے اس لئے لازم ولابد ہے کہ اس سے پیشتر کہ وہ دیدارِ الہیٰ یا رویۃ اللہ سے مسرور شادمان ہو اور موافقت ومحبت کے ساتھ خدا کے حضور میں رہ سکے دوبارہ اس پاک ذات کے ساتھ روحانی مشابہت حاصل کرے۔

اگر اس معاملہ کے متعلق ہم بائبل کا دنیا کی دیگر کتب دین کے ساتھ مقابلہ کریں تو اس امر میں زمین وآسمان کا فرق نظر آئیگا کیونکہ دیگر مذاہب کی کتابیں ہم کو کچھ نہیں بتلاتیں کہ خدا نے انسان کو کس مقصد سے پیدا کیا۔ ان میں انسان کی دلی وروحانی طہارت وتقدیس کی ضرورت کے بارے میں کوئی تعلیم مندرج نہیں ہے ۔ ان میں یہ تعلیم پائی جاتی ہے کہ بدن کے وضوو غسل سے طہارت یا پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اورحج وقربانی یا خیرات وغیرہ سے گناہوں کی معافی حاصل ہوسکتی ہے ۔ بیشک جسم کے وضوو غسل کی ضرورت ہے اوران سے جسم کو بہت فائدہ پہنچتا ہے لیکن ان کے وسیلہ سے دل پاک نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ سیدنا مسیح بھی فرماتے ہیں کہ یہ کافی نہیں کہ پیالے یا رکابی کو باہر سے صاف کریں اوراندر سے میلارہنے دیں۔ اس کے الفاظ(متی ۲۳: ۲۶میں یوں مرقوم ہیں" پہلے پیالے اوررکابی کو اندر سے صاف کرتا کہ اوپر سے بھی صاف ہوجائیں "۔ نیک اعمال بھی ضرور ہیں کہ خدا کی محبت اوراس کی مرضی سے موافقت اوراس کے عفو رحم کی شکر گزاری کا نتیجہ ہوں لیکن خیرات کرنے سے خداہمارے گناہ بخشنے کی طرف مائل نہیں ہوسکتا کیونکہ کوئی عادل حاکم رشوت لے کر مجرم کو معاف نہیں کرتا۔خیرات اور تمام دیگر نیک اعمال کی قدروقیمت خدا کی نظر میں اس نیت کے موافق ہوتی ہے جس سے انسان انِ اعمال کا عامل بنتا ہے اور کوئی شخص اپنی نیت کو اس عالم الغیب سے چھپا نہیں سکتا جس کے سامنے بنی آدم کے دلوں کے پوشیدہ راز بالکل کھلے اوربے پردہ ہیں۔

اس غرض سے کہ ہم خدا کی مرضی کو پہچان کر اس کی فرمانبرداری کرسکیں اس رحیم وکریم نے عہدِ عتیق وجدید میں ہم کو بہت سی تعلیم دی ہے ۔ اس طرح سے اس نے ہم کو صاف سمجھادیاہے کہ کونسی باتوں کو عمل میں لانا اور کونسی باتوں سے پرہیز کرنا ہمارے لئے مناسب ہے۔ لہذا بائبل کے مختلف مقامات میں اخلاقی شریعت مختصر وسادہ قوانین کی صورت میں ہم کو دی گئی ہے۔ توریت میں دس احکام دئے گئے ہیں(خروج ۲۰: ۱تا ۱۷، استثنا ۵: ۶تا ۲۱) پھر بعد میں میکاہ نبی فرماتا ہے کہ انسانی فرائض کے بارے میں خدا کی شریعت کا خلاصہ یوں بیان ہوسکتا ہے " اے انسان اس

نے تجھے وہ دکھا دیا ہے جو کچھ کہ بھلاہے اورخداوند تجھ سے اور کیا چاہتاہے کہ مگر یہ کہ تو انصاف کرے اور رحم دلی کو پیار کرے اوراپنے خدا کے ساتھ فروتنی سے چلے" (میکاہ ۶: ۸) ۔ناخواندہ وجاہل لوگ اکثر کہا کرتے ہیں کہ مسیحیوں کے پاس کوئی شریعت نہیں جس میں خدا کے اوامر ونواہی مندرج ہوں لیکن اس قول کی تردید کے لئے یہ حقیقت کافی ہے کہ عہدِ عتیق کی اخلاقی شریعت کی پابندی واطاعت ہم پر فرض ہے۔ عہدِ جدید میں ہمارے پاس سیدنا مسیح کے پہاڑی وعظ کی شریعت موجود ہے (متی ۵، ۶، ۷) اور علاوہ برین اس نے ہمارے فرائض کو مرقس ۱۲: ۲۸، ۳۱، لوقا ۶: ۳۱ میں مجموعاً بیان فرمایا ہے۔ لہذا ہم صاف دیکھتے ہیں کہ وہ دیگر واضعانِ قوانین دین وشریعت دینے والوں کی طرح ہر ممکن حالت کے لئے خاص ہدایت دینے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ ایسے عام اصول بتاتاہے جن سے تمام حالاتِ زندگی میں ہماری ہدایت ورہبری ہو۔ جو کوئی رومیوں ۱۲، ۱۴: ۱-۸وپہلا کرنتھیوں ۱۳، افسیوں ۵: ۱-۲۱- کلسیوں ۳: ۱، ۴: ۱ کو بغور مطالعہ کریگا اس کو معلوم ہوجائیگا کہ مسیحیوں کے لئے کیسی اعلیٰ اور پاک راہ مقرر کی گئی ہے۔ ہم کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ دعا ونماز سے پیشتر اپنے دلوں کو پاک کریں نہ یہ کہ فقط ہاتھ دھولیں ۔ نہ یہ کہ تمام عمر میں ایک مرتبہ حج کرلیں بلکہ یہ حکم ہے کہ ہمیشہ اپنے آپ کو اس دنیا میں مسافر وحاجی خیال کریں اورکہیں دائمی سکونت کا خیال نہ باندھیں اوریہاں کسی شہر سے دل نہ لگائیں بلکہ ہمیشہ اس امر کے منتظر رہیں کہ ابدی مکانوں میں سکونت کرنے کے لئے ہمیشہ اس امر کے منتظر رہیں کہ ابدی مکانوں میں سکونت کرنے کے لئے پاکیزگی میں خدا کی قربت میں ترقی کرتے چلے جائیں نہ یہ کہ دن بھر میں فقط پانچ مرتبہ نماز پڑھ لیں بلکہ یہ حکم ہے کہ ہمیشہ دعاومناجات میں لگے رہیں(۱ تھسلنیکیوں ۵: ۱۷) یعنی ایسے طور سے زندگی بسر کریں کہ ہمیشہ خدا سے صحبت رکھیں۔ نہ فقط یہودی قوم کی طرح مردہ جانوروں کی قربانیاں گذرانیں بلکہ " اپنے آپ کو ایسی قربانی ہونے کے لئے نذ کریں جو زندہ وپاک اور خدا کو پسندیدہ ہو" (رومیوں ۲: ۱، ۲اور ۱ پطرس ۲: ۵)۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ عہد جدید کے احکام وشریع عہدِ عتیق کے احکام سے بھی بڑھ کر خدای پاک ورحمان کی عالیشان سے موافقت ومطابقت رکھتے ہیں کیونکہ ان سے دل اور زندگی کی پاکیزگی کی ہدایت اور کامیابی حاصل ہوتی ہے ۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جب تک انسان ایسا پاک دل ونیک اعمال نہ بن جائے تب تک ظاہری رسوم کی بجاآوری خدا کی نظر میں بالکل ہیچ ہے اور نیکی وراستبازی تک نہیں پہنچاسکتی ۔ احکام واصولِ انجیل تمام دیگر ادیان کے احکام وآئین سے اعلیٰ وبالاہیں کیونکہ ان میں انسانی دل اور اس کی عملی زندگی کو پاک کرنے کی خاص قابلیت ہے۔ پس ان کو یہودی دین کے سوا تمام دیگر ادیان کے احکام کی طرح انسانی احکام جان کر نہیں ماننا چاہیے بلکہ ان کو خود خدا کے احکام کے طور پر قبول کرنا واجب ہے۔ انجیل کے تمام احکام ان الفاظ میں مجتمع ہیں" خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اوراپنی سال جان اوراپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔۔۔۔۔ اور اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ" (متی ۲۲: ۳۷تا ۳۹) یہ الفاظ کچھ خفیف سی وسعت کے ساتھ توریت سے اقتباس کئے گئے ہیں (استثنا ۶: ۵، ۱۰: ۱۲، ۳۰: ۶ احبار ۱۹: ۱۸)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہدِ عتیق وجدید اس تعلیم میں متفق ہیں کہ خدا انسان سے کیا چاہتا ہے اور کونسی راہ اختیار کرنے کے لائق ہے۔ خدا ہم سے یہ طلب کرتا ہے کہ ہمارے دل اس کی محبت سے جس نے

پہلے ہم سے محبت رکھی ایسے معمور ہوں کہ ہم اپنی تمام جسمانی وروحانی اور ذہنی طاقتوں کو ہر وقت وہر آن کامل خوشی کے ساتھ اس کی خدمت وخوشنودی میں صرف کرنے کی کوشش کریں اور جس طرح سے ہم اپنے نفع وفائدہ کے خواہان وجویان رہتے ہیں اسی طرح سے اپنے پڑوسیوں کی بہتری وبہبودی میں دل وجان سے مساعی وکوشاں رہیں۔ ہمیں یہ بھی یادرکھنا چاہیے کہ خدا کی نظر میں ہمارے دشمن بھی ہمارے پڑوسی ہیں (لوقا ۱۰: ۲۵تا ۳۷) ۔ایسا کرنے سے ہم سیدنا مسیح کے سنہلے قاعدہ پر کاربند ہوجائینگے۔وہ فرماتا ہے "جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں وہی تم بھی ان کے ساتھ کرو"(متی ۷: ۱۲)۔

بائبل کے یہ آئین واصول جس قدر انسان کو محبت کے رشتہ کے وسیلہ سے خداوندذوجلال اور تمام بنی آدم سے ملاتے ہیں اور دل کو پاک کرکے خود غرضی سے آزاد کرتے ہیں اسی قدر نیک بختی وسعادتِ دارین کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ وہ اس اخلاقی شریعت سے بھی موافقت ومطابقت رکھتے ہیں جو خدا نے تمام بنی آدم کی الواحِ قلوب وضمیر پر کندہ کررکھی ہے۔ یہ اس امر کا نہایت ہی بین ثبوت ہے کہ بائبل کی تعلیمات انسان کے اور تمام جہان کے خالق کی طرف سے ہیں۔ لہذا بائبل کاالہام اظہر من الشمس ہے۔ پس وہ جن لوگوں نے اب تک کتبِ مقدسہ کو قبول نہیں کیاوہ بے شریعت نہیں کیونکہ خدانے یہ اخلاقی شریعت ان کے دلوں میں رکھ دی ہے۔ پس تمام بنی آدم ان باتوں کو عمل میں نہ لانے کے لئے جن کووہ درست اوراپنے آپ پر فرض جانتے ہیں خدا کے حضور جوابدہ ہونگے۔ اس اخلاقی شریعت کے موافق غیر اقوام سے بھی باز پُرس ہوگی اوران کو بھی اپنے ضمیر سے کسی حد تک یہ سیکھنا اور معلوم کرنا ہے کہ چونکہ انہوں نے اپنی اندرونی شریعت کی خلاف ورزی کی ہے لہذا وہ خدا کی نظر میں گنہگار اور نجات دہندہ کے محتاج ہیں۔ کلام اللہ یعنی بائبل کو قبول کرنے سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اندرونی اخلاقی شریعت کواپنے خدا کی طرف سے ہونے پر اس سے نئی شہادت حاصل ہوتی ہے۔علاوہ برین جو لوگ کتبِ مقدسہ کو قبول کرتے ہیں ان کی قوتِ فیصلہ روشن ہوجاتی ہے اوروہ اپنے فرائض کو زیادہ صفائی سے سمجھنے لگتے ہیں اوران کو بجالانے کے لئے خدا سے مدد وفضل حاصل کرنے میں ان کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔

کتبِ مقدسہ سے ہم کو یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ حق ودرست بات کو جاننا ہمیں راستباز نہیں ٹھہراتا بلکہ مجرم قرار دیتاہے کہ تاقتیکہ ہم اپنے فرائض بجانہ لائیں (متی ۷: ۲۱، ۲۷۔لوقا ۱۰: ۲۵، ۲۸۔ یوحنا ۱۳: ۱۷ اور رومیوں ۲: ۱۳) علاوہ برین یہ تعلیم بھی مندرج ہے کہ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ احکام الہیٰ کی بجاآوری میں کوئی کمی یا نقص نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ان سے ہماری اخلاقی روش کا کمال مقصود ہے (متی ۵: ۲۸)اگر کوئی آدمی خدا کی تمام شریعت پر عمل کرے اور فقط ایک حکم کو توڑے تووہ اس ایک ہی حکم کے ٹوٹنے سے گنہگار ٹھہریگا(یعقوب ۲: ۱۰، ۱۱، گلتیوں ۳: ۱۰، ۱۲)۔ انسانی شرائع وقوانین کا بھی یہی حال ہے۔ تمام مہذب ممالک میں خون اور چوری کرنا ممنوع ہے۔ اگر کوئی آدمی خونی نہ ہواور فقط ایک بار چوری کرے تو وہ مجرم ہے اور سزا کا سزاوارو مستحق ہے۔ کتبِ مقدسہ میں حضرت آدم کا فقط ایک ہی گناہ مذکور ہے لیکن اس ایک ہی گناہ کا نتیجہ کیا ہوا؟ سزا کا حکم اور موت خدا کی خوشنودی اس کی شریعت کے بعض حصوں کی محافظت سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ جو کوئی خدا کو خوش کرتا اوراپنے اعمال کے وسیلہ سے اس کی نظر میں راستباز ٹھہرنا چاہتاہے اسے لازم ہے واجب ہے کہ اس کی شریعت

کی محافظت اور بجاآوری میں بالکل بے عیب ہو۔ چھوٹے سے چھوٹے حکم کو توڑنا اسے گنہگار ٹھہرائیگا اوراس کو خدا سے جدا و برگشتہ کرکے مستوجبِ عقوبت قرار دیگا۔

لیکن کیا کوئی ایسا انسان ہے جس نے شب وروز عمر بھر حق تعالیٰ کی شریعت کی کامل فرمانبرداری وبجاآوری کی ہوا اوراس سے کبھی ذرہ بھی اس کی خلاف ورزی نہ ہوئی ہو؟ کیا کوئی ایسا مخلص بندہ پایا جاسکتا ہے جس نے ہمیشہ خدا سے اپنے تمام دل اور تمام جان اور اپنی تمام سمجھ سے محبت رکھی ہو اور اپنے پڑوسی سے ایسی محبت رکھی ہو جیسی اپنے آپ سے؟(متی۲۲:۳۷تا ۳۹)۔ یا کیا کوئی ایسا شخص ہے جس نے عمر بھر کبھی کوئی براکام نہیں کیا یا کوئی ایسی بات منہ سے نہیں نکالی جو خدا کو ناپسند ہو یا اپنے دل میں کسی بُرے خیال یا بُری خواہش کوجگہ نہیں دی؟(دیکھو ایوب ۴: ۱۸، ۱۹ ۲۵: ۴، ۵، ۶ ۔زبور۱۴۳: ۲۔رومیوں ۳: ۲۰)۔فقط ہمارے سیدنا مسیح ہی ایک ایسے آدمی ہوئے ہیں۔

پس جب ہم نے یہ معلوم کرلیا کہ ہمارے اپنے ضمیر اور کلام اللہ کی شہادت کے مطابق سیدنا مسیح کے سوا تمام بنی آدم گنہگار ہیں تو کیا نہایت مناسب نہیں ہے کہ ہم سچی توبہ کے ساتھ اپنے خالق کے حضور میں صاف اقرار کریں اورکہیں " اے خداوندوں کے خداوند اور قدوس ونیک خدا جو پاکیزگی تو چاہتا ہے۔وہ ہم میں نہیں ہے۔اے خداوند ہم تو تیرے قہر اور ابدی ہلاکت کے حقدار نہیں"۔

اول توہمارے ضمیر اور دوم ہمارے تجربہ اور سوم کلام اللہ سے (مثلاً حزقی ایل ۱۸: ۲۰۔ متی ۱۲: ۳۶۔ ۲۵: ۴۱۔ رومیوں ۱: ۸، ۲:۸، ۹ کلسیوں ۳: ۲۵ ۔ ۲ تھسلنیکیوں ۱: ۹)صاف تعلیم ملتی ہے کہ خدا گنہگاروں کو سزا دیتا ہے ۔ بعض لوگ یہ خیال کئے بیٹھے ہیں کہ خداوند کریم اپنے لامحدود رحم کے سبب سے گنہگاروں کو بے عذاب وعقوبت ہی معاف کردیگا۔

لیکن جب تک خدا کی راست شریعت کے تقاضے کسی طرح سے پورے نہ ہوں ایسی معافی اخلاقی طورپر بالکل ناممکن ہے ورنہ اس کا عدل ناقص ٹھہریگا اوروہ خود اپنے ہی قول کی خلاف ورزی کریگا۔ اس میں شک نہیں کہ خدا کی محبت ورحمت لامحدود ہیں لیکن اس کا عدل اوراس کی قدوسیت بھی لامحدود ہیں۔ لہذا بدکار لوگ کبھی اس کے منظورِ نظر نہیں ہوسکتے کیونکہ اس کو ہر طرح کے گناہ سے نفرت ہے۔

علاوہ برین گناہ خودہی گنہگار کے لئے سزاولعنت ہے۔ کوئی گنہگار بھی خوش نہیں اور نہ ہر دوجہان میں خوش ہوسکتا ہے۔ مثلاً جوآدمی شہوت سے معمور ہے وہ اس دنیا میں بھی کبھی سچی خوشی سے واقف نہیں ہوسکتا۔ گناہ انسان کو بے رحم وبزدل اور خودغرض وکمینہ بنا کر دنی النفس بنادیتا ہے اور روحانی طورپر خدای پاک سے جس کے حضور میں کامل خوشی ہے دور ومردود کردیتا ہے" جو کوئی گناہ کرتا ہے گناہ کا غلام ہے"(یوحنا ۸: ۳۴)۔ سب سے ہولناک سزا جو گنہگار کومل سکتی ہے وہ ابدی گنہگاری کی حالت ہے جوان لوگوں کا حصہ ہے جو آخر کار نور کے عوض میں تاریکی اور نیکی کے عوض میں بدی کو اور خدا کی جگہ شیطان کواپنے لئے پسند کرلیتے ہیں (یوحنا۳: ۱۹ اور مکاشفہ ۲۲: ۱۱)۔

یہ بھی کی صفت محبت کے موافق ومطابق ہے کہ وہ انسان کو ہر ایک گناہ کی سزا دیتا ہے کیونکہ اگر بنی آدم کو ایسا معلوم ہوتا کہ خدا گنہگاروں کو سزا

نہیں دے گا تو وہ اور بھی روز بروز ورطہ گناہ میں غرق ہوتے چلے جاتے اور اپنی اور
اوروں کی تباہی و بربادی کا باعث ٹھہرتے۔ پر بھی صاف طور پر ہے کہ خدا کی
شریعت کی خلاف ورزی کا نتیجہ ضرور عذاب ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو پھر اس
کی کیا ضرورت ہے کہ اخلاقی شریعت موجود اور کتب مقدسہ و بنی آدم کے دلوں
میں مرقوم ہو؟ کوئی خدا کے مخلص ووفادار بندے یکساں اس کے مقبول ٹھہرینگے
اور وہ ان سے ایک ہی طرح کا سلوک کریگا۔

چونکہ ایک کے سوا تمام بنی آدم گناہ میں گرگئے ہیں اس لئے سب
کے سب مستوجب عقوبت ہیں۔ ہم گنہگار بنی آدم میں سے کوئی بھی خدا کو
خوش کرنے اور اپنے گناہوں کی کفارہ دیکر معافی حاصل کرنے اور اس سے ملاپ
حاصل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ ہماری ضرورت فقط یہی نہیں ہے کہ ہم
گناہ سے رہائی پانے کی کوئی راہ مل جائے بلکہ اس سے بڑھ کر ہم اس امر کے
محتاج ہیں کہ گناہ کی قدرت اور محبت سے بھی نجات پائیں۔ گنہگار کے لئے سزا
بہت اچھی اور فائدہ مند چیز ہے اور اکثر اوقات توبہ کی طرف اس کی ہادی
ورہنمائی ہوتی ہے۔ اسی لئے ہمیشہ گناہ کے بعد سزاوار ہوتی ہے۔ لیکن گناہ کے
ابدی نتیجہ یعنی خدا کے حضور سے ہمیشہ کے لئے خارج ومردود اور اس آسمانی
باپ کی محبت ومحافظت سے محروم ہونے سے اور دل ودماغ میں شیطان کی مانند
بننے سے ضرور ہم کو راہِ نجات تلاش کرنا چاہیے ورنہ ہمارے حق میں بہتر تھا کہ
ہم پیدا ہی نہ کئے جاتے۔

ہم یہ راہِ نجات کیونکر حاصل کریں؟ اگر انسان اپنی موجودہ گناہ آلودہ
حالت میں خدا کی کامل شریعت کی کامل پیروی نہیں کرسکتا تو اپنے گذشتہ زمانہ
کے گناہوں کا کفارہ کیونکہ دے سکتا ہے؟ اور کس طرح سے خدا سے میل حاصل
کرسکتا ہے؟ یہ صاف ظاہر ہے کہ اس کے نیک اعمال کسی کام کے نہیں ہیں
کیونکہ خدای پاک آلودہ ہاتھوں سے تحفہ قبول نہیں کرتا اور گناہ آلودہ کا ہدیہ اسے
اور بھی ناپسند ہے۔ نہ فقط انسان کے اعمال اوفعال بلکہ اس کے اقوال وخیالات
بھی گناہ آلودہ ہیں۔ جبکہ ہم نے حقوق العباد اور حق اللہ کو بھی ادا نہیں کیا تو ہم
اطاعت وعبادت سے اتنا ثواب کب حاصل کرسکتے ہیں کہ ہمارے تمام گناہوں
کا معاوضہ ہوسکے؟ ایسا کرنا ہمارے لئے بہر حال ناممکن ہے۔ اگر کوئی انسان
ایسا ہو کہ اس نے عمر بھر کبھی خدا کے کسی حکم کو نہیں توڑا تو اس نے بھی اپنے
فرض کی بجاآوری سے زائد کچھ نہیں کیا(لوقا ۱۷: ۱۰) ۔ایسا آدمی بھی یہ
نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اپنے لئے اور دیگر بنی آدم کے لئے ثواب ونیکی کا خزانہ
جمع کرلیا ہے۔

کتبِ مقدسہ سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ شریعت الہیٰ ہم سے ایسی کامل
محبت واطاعت کا تقاضا کرتی ہے کہ اگر اس میں کچھ کمی واقع ہوجائے تو کسی طرح
سے اس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو بڑے فخروجہالت
سے کہتے ہیں کہ جس قدر عبادت ، اطاعت خدا ہم سے طلب کرتا ہے ہم نے اس
سے بھی زیادہ کی ہے لیکن ایسا کہنے کی حماقت صاف ظاہر ہے۔ باوجود اس قسم
کی لاف زنی کے ایسے لوگ کسی طرح سے اپنے آپ کو یہ یقین نہیں دلاسکتے کہ وہ
خدا کی نظر میں راستباز ہیں۔ ان کے دلوں میں موت کے بعد کی حالت کے
بارے میں بسا اوقات نہایت رنجدہ شکوک پیدا ہوتے ہیں ۔ وہ اکثر موت سے
لرزاں وترساں زندگی بسر کرتے ہیں اور حددرجہ کی عقلی وذہنی بے چینی میں
مرتے ہیں۔ مثلاً ابوعمران ابراہیم ابن یزید کے بارے میں ابن خلکان بیان کرتا
ہے کہ " وہ نہایت مشہور اماموں میں سے تھا۔ جب موت کا وقت آیا تو نہایت

خوف زدہ ہو گیا۔۔۔۔ چنانچہ کہنے لگا جس خطرہ میں ، میں ہوں اس سے بڑا خطرہ کیاہوسکتا ہے؟ میں اپنے خداوند کی طرف سے ایک قاصد کا منتظر ہوں جو فردوس یا نارِ جھنم کے ساتھ آئیگا"۔ پھر اس نے قسم کھا کر کہا کہ میرے نزدیک مرنے سے یہ بہتر ہے کہ میری روح قیامت تک میرے حلق[1] میں پھڑ پھڑاتی رہے۔ یہ اس عذاب کی دہشت کے سبب سے تھا جس کا وہ موت کے بعد منتظر تھا۔ صرف توبہ بھی ہمارے گناہوں کودھوڈالنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ یہ تونہایت مناسب ہے کہ ہم صدقِ دل وخلوص نیت کے ساتھ اپنے گناہوں سے تائب ہوں لیکن جن گناہوں کے ہم مرتکب ہوچکے ہیں ہم ان کو فقط توبہ ہی کے وسیلہ سے اپنے اعمال نامہ سے محو نہیں کرسکتے۔ لہذا توبہ ہم کو بچانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ انسانی قوانین کی خلاف ورزی کا بھی اس طرح سے معاوضہ نہیں ہوسکتا۔ اگر کوئی چور یا خونی کسی حاکم سے کہے کہ اب میں نے توبہ کرلی ہے تو کیا حاکم ازروی عدل وانصاف اس کو رہا کرسکتا ہے؟ ایسا کرنا ہمارے طبعی خیال اس اخلاقی شریعت کا حصہ ہے جو خدا نے ہمارے دلوں پر لکھ دی ہے۔ لہذا یہ خیال درست ہے۔ بسا اوقات لوگ ایسے سخت دل ہوجاتے ہیں کہ توبہ کرنا چاہتے بھی ہیں تو نہیں کرسکتے۔

پس ہم نے دیکھ لیا ہے کہ ہم اپنے اعمال کے وسیلہ سے اپنے آپ کو اپنے گناہوں کی سزا یا ان کے دیگر بد نتائج سے کسی طرح سے بھی بچا نہیں سکتے۔ اس سے بڑھ کر یہ امر بالکل ناممکن ہے کہ ہم کچھ ثواب کما کر اپنے آپ کو گناہ کی محبت وقدرت سے بچائیں اور خدا سے میل حاصل کریں۔ لہذا اگر کوئی نجات دہندہ نہیں جو ہمارے گناہوں کا کفارہ دے سکے تو ہم ہمیشہ خدا سے دور ومردود رہینگے اور کبھی اس راحت وآرام کو حاصل نہیں کرسکینگے جس کی آرزو خدا نے ہر ایک دل میں رکھ دی ہے۔

یہ امر واضح ہوچکا ہے کہ اگر کوئی نجات دہندہ ہے جو گناہوں کا کفارہ دینے اور گنہگاروں کو گناہ سے آزاد اور خدای عادل وپاک کی نظر میں پاک بنانے کی قدرت رکھتا ہے تووہ نجات دہندہ محض انسان نہیں ہوسکتا جس نے دیگر بنی آدم کی طرح پیدا ہو کر آدم کی گناہ آلودہ ذات وسرشت کوورثہ میں پایا ہو اور خود بھی گنہگار ہو۔ کوئی گنہگار گنہگاروں کو نہیں بچاسکتا۔ چونکہ تمام بنی آدم جو محض انسان ہیں گنہگار اس لئے ان میں سے کوئی بھی اوروں کو بچانے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ زبور میں مرقوم ہے " ان میں سے کسی کو مقدور نہیں کہ اپنے بھائی کو چھڑائے یا اس کا کفارہ خدا کو دے" (زبور ۴۹: ۷) جبکہ کوئی کسی کو جسمانی موت سے بھی نہیں بچاسکتا تو یہ بات بالکل سچ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی کسی دوسرے کو ابدی ہلاکت سے بچانے کی قدرت نہیں رکھتا۔

پھر بھی اگر کوئی نجات دہندہ ہے تو لازم ہے کہ انسان ہو ورنہ وہ ہمارا قائم مقام اور ہم میں سے ہو کر کل بنی آدم کا سردار وپیشوا نہیں ہوسکتا اور ہم کو اس امر کا کافی یقین نہیں ہوسکتا کہ وہ ہم کو خوب سمجھتا ہے اور ہم سے ہمدردی کرتا اور محبت رکھتا ہے۔ لہذا لازم ہے کہ وہ جن کو بچاتا ہے ان سے اپنی ذات ورتبہ کے لحاظ سے بزرگ وبرتر ہو لیکن کسی نہ کسی طرح سے ان کی ذات میں شریک بھی ہو۔ ضرور ہے کہ وہ بالکل بے گناہ اور خدا کی شریعت کا کامل طور سے فرمانبردار ہو۔ عقل خود تسلیم کرتی ہے کہ اگر کوئی بنی آدم کا نجات دہندہ

---

[1] ولما حضرته الوناة جزع جزعا عاشد ایدا۔۔۔۔ فقال وای خطر اعظم مما انا نیه انا توقع رسولا یرو علی من ربی اما بالجناة واما بالنار، واللہ لوددت انها تلجهم فی خلقی الی یوم القمة وافیات الاعیان ابن خلکان جلد اول صفحہ ۲ جس کو فارس میں آقا میرزا علی اکبر نے طبع کروایا۔

ہو تو ایسا ہی ہونا چاہیے۔اگر ایسا نجات دہندہ نہ ہو تو بنی آدم کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ ان کی کوئی امید نہیں اور وہ اس پاکیزگی وراحت کو کبھی حاصل نہیں کرسکتے جس کی آرزو طبعی طور پر تمام بنی آدم کے دلوں میں جوشزن ہے۔

لیکن کیا کوئی ایسا نجات دہندہ ہے؟ بائبل کے مطالعہ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ بیشک ایک ایسا نجات دہندہ ہے۔ عہدِ عتیق میں اس کی آمد کا وعدہ مندرج ہے اور عہدِ جدید سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آگیا۔ انبیاورسل نے بالاتفاق اس پر شہادت دی ہے کہ فقط وہی حقیقی نجات دہندہ ہے جس نے خدا کے حضور تمام جہان کے گناہوں کا کامل کفارہ گذرانا ہے (۱ یوحنا ۲: ۱، ۲) اور جو اس طرح سے گنہگاروں کے لئے معافی حاصل کرسکتا ہے۔ یہ نجات دہندہ سیدنا مسیح ہیں جنہوں نے اپنی بزرگی وقدسیت اور موت تک کامل فرمانبرداری کے وسیلہ سے جہان کے گناہوں کا اٹھالیا اور جو تمام بنی آدم کا اکیلا درمیانی ہے۔ اس نے کفارہ دے کر انسان کا خدایِ قدوس وپاک سے میل کرادیا ہے اور جو اس پر صدقِ دل سے ایمان لاتے ہیں ان سب کے لئے نجات حاصل کی ہے۔ پس وہ تمام بنی آدم کے سامنے گناہ کی معافی اور ابدی خوشی پیش کرتا ہے۔

لہذا ہم شکر گزار دلوں سے رسول کے ساتھ ہم آواز ہو کر کہتے ہیں " اب ازلی بادشاہ یعنی غیر فانی نادیدہ واحد خدا کی عزت وتمجید ابدلآباد ہوتی رہے "(۱ تمیتھیس ۱: ۱۷) کیونکہ اس حی القیوم اور ودود ورحمان خدا نے اپنی لا محدود ومحبت ورحمت سے سیدنا مسیح میں ہم گنہگاروں کو ایسے بڑے کفارہ اور ایسی جلالی نجات کی بخشش عطا فرمائی ہے۔

چوتھا باب

وہ طریق جس سے سیدنا مسیح نے تمام بنی آدم کی نجات کے کام کو پورا کیا

اب ہم قادرِ مطلق خدا کا نام لے کر اوراس کی ہدایت ورحمت پر بھروسا کرکے یہ بیان کرینگے کہ عہدِ عتیق وجدید کی تعلیم کے موافق سیدنا مسیح نے بنی آدم کی نجات کے کام کو کس طریق سے پورا کیا۔ ممکن ہے کہ خدا کی عجیب تدبیرِ نجات میں بہت کچھ ہماری محدود عقل سے باہر اور بالاوبرتر ہو اور یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ ہم اس کے الہیٰ نارآذوں کو مطلق نہیں جان سکتے مگر فقط اسی قدر جو اس نے اپنی کمال رحمت سے ہم پر ظاہر فرمادیا ہے۔ لیکن چونکہ اس نے ہم کو عقل وقوت استدلال عنایت کی ہے اس لئے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ وہ چاہتا ہے کہ ہم اپنی عقل کو اس کے جلال کے لئے استعمال کریں اور چونکہ اس نے اپنے فضل وکرم سے راہِ نجات کو ہم پر ظاہر فرمادیا ہے اس لئے وہ چاہتا ہے کہ ہم ادب کے ساتھ اس پر غور وفکر کریں اور جہاں تک محدود مخلوق سے ہوسکتا ہے اسے سمجھیں (۱ تھسلنیکیوں ۵: ۲۱) ہماری نجات کا دارومدار ہماری عقل کی حدتِ وتیزی پر نہیں بلکہ دنیا کے نجات دہندہ پر ہمارے ایمان کی حقیقت پر ہے۔

عہدِ جدید میں اس امر کی نہایت صاف تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ جل شانہ نے سیدنا مسیح کے وسیلہ سے اپنی کمال محبت ورحمت سے گنہگاروں کو نجات کاوعدہ بخشا ہے(مثلاً لوقا ۱۹: ۱۰- یوحنا ۳: ۱۶- ۲ کرنتھیوں ۵:

۱۹، ۲۱، ۱ تمیتھیس ۱: ۱۵ ۱ پطرس ۲: ۲۱-۲۴- ۱ یوحنا ۲: ۱۲، ۴: ۹، ۱۰، پس یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ اس طور پر نجات کی تیاری کی گئی ہے۔ اب ہم کو یہ بیان کرنا ضرور ہے کہ سیدنا مسیح کے وسیلہ سے نجات کیونکر حاصل ہوسکتی ہے اور ان آیات میں اور دیگر مقامات پر اس کو ایسے بڑے بڑے عالیشان القاب کیوں دئے گئے ہیں۔ اس طرح سے ہم کسی حد تک اس کی ذات کی حقیقت اور عظمت کو سمجھینگے اور دیکھینگے کہ تیسرے باب کے آخر کی مندرجہ شرائط کو وہ کس طرح سے پورا کرتا ہے۔

کتبِ مقدسہ سے صاف عیاں ہے کہ خدایِ ذوالجلال نے اپنی لامحدود محبت اور بے نہایت رحمت سے ابتدایِ عالم سے یہ راہِ نجات مقرر کر رکھی تھی (افسیوں ۳: ۱۱، ۱ پطرس ۱: ۱۸، ۲۱۔ مکاشفہ ۱۳: ۸) اوراسی لئے اس نے عہدِ عتیق میں اپنے انبیا کی زبانی بیان فرمادیا تھا کہ وہ نجاتِ دہندہ کونسے فرقہ اور خاندان سے پیدا ہوگا۔ اس کے ظہور کا وقت اور طریقہ بھی ظاہر کردیا اوراس کی ذات ومرتبت کا بھی ذکر کردیا اور صاف بتادیا تھا کہ وہ کس طور سے اپنی عظیم رحمت یعنی کفارہ کے کام کو سرانجام دیگا۔ چنانچہ صدیوں پیشتر جو اس کی مبارک آمد کے الہیٰ وعدہ کو جانتے تھے وہ اس ظاہر ہونے والی بڑی نجات کی امید میں خوشی مناتے تھے۔ حضرت آدم تمام بنی آدم کے باپ کو خداوند کریم نے اس آنے والے منجی کی آمد کی خبر دی تھی۔ اسے بتلایا گیا تھا کہ منجئی موعود ایسا صاحبِ قدرت ہوگا کہ سانپ کے سر کو کچل "ڈالیگا یعنی شیطان پر غالب آئیگا اور بنی آدم کو اس کی غلامی اور گناہ سے آزاد کریگا (پیدائش ۳: ۱۴، ۱۵)۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ اس کی نسل سے تمام اقوامِ عالم برکت پائیگی (پیدائش ۲۲: ۱۸) اور عہدِ جدید نہایت صفائی اور صراحت کے ساتھ بتاتا ہے کہ ان وعدوں کا موعود سیدنا مسیح تھے (گلتیوں ۳: ۱۶)۔

پھر اللہ جل شانہ نے حضرت موسیٰ کی معرفت وعدہ فرمایا کہ یہ نجات دہندہ بنی اسرائیل میں سے ایک بڑا جلیل القدر نبی ہوگا (پیدائش ۱۷: ۱۹، ۲۱، ۲۸: ۱۴ کے مطابق) اور بنی آدم کو خدا کی راہ اور مرضی کی تعلیم دیگا (استشنا ۱۸: ۱۵، ۱۸: ۱۹) جس نبی کا یوں ذکر کیا گیا وہ سیدنا مسیح تھے اوراس کا ثبوت واظہار اس آسمانی آواز میں پایا جاتا ہے جس نے لوگوں کو اس کی فرمانبرداری کا حکم دیا تھا (متی ۱۷: ۵، مرقس ۹: ۷)۔ چنانچہ خدا نے حضرت موسیٰ سے فرمایا تھا کہ اگر لوگ نبیِ موعود کے شنوا نہ ہونگے تو سخت سزا پائینگے۔

یہ الہیٰ پیغام حضرت داؤد کو بھی پہنچا اوراسے بتایا گیا کہ وہ نجات دہندہ اس کی نسل سے ہوگا اوراسکی سلطنت ابدی ہوگی (۲ سموئیل ۷: ۱۶، زبور ۲۹: ۳۵، ۳۶، ۳۷ یسعیاہ ۹: ۶، ۷، ۱۱، یرمیاہ ۲۳: ۵، ۶، ۳۳: ۱۵، ۱۲: ۱۷: ۲۰، ۲۱: ۲۵، ۲۶، دیکھو یوحنا ۱۲: ۳۴۔

پیدائش ۴۹: ۱۰ میں مرقوم ہے کہ جب تک شیلوہ نہ آئے یہوداہ کے خاندان سے سلطنت جاتی نہ رہیگی شیلوہ مسیح موعود کے القاب میں سے ایک لقب ہے۔ سنہ عیسوی کی ابتدا سے چار یا پانچ سال پیشتر سیدنا مسیح داؤد کی نسل سے پیدا ہوئے (متی ۱: ۱، واعمال الرسل ۲: ۳۰، ۱۳: ۲۲، ۲۳ رومیوں ۱: ۳) اس مقام پر ہمیں یہ بتانا ضرور ہے کہ شہنشاہ جسٹین کے عہدِ

سلطنت میں ایک راہب ڈایوانی سئیس اصغر کے غلط اندازہ سے سنہ عیسوی کا
آغاز مقرر ہوا۔ اس نے چند سال کی غلطی کی لیکن معمولی شمار کے قائم رکھنے میں
بہت آسانی ہے۔ یہودیوں کے بادشاہ ہیرودیس اعظم نے سنہ [illegible] چار
سال پیشتر یعنی جب سیدنا مسیح دوسال کے تھے وفات پائی (متی ۲: [illegible]
اور اس وقت سلطنت چار حصوں میں منقسم ہوگئی۔ ہیرودیس [illegible]
ان میں سے فقط ایک حصہ یہودیہ کا حاکم مقرر کیا گیا لیکن قریباً [illegible]
رومیوں نے اسے تخت سے اتار کر جلاوطن کردیا۔ اس وقت سے یہودیہ [illegible] گانہ
سلطنت رہا بلکہ رومی سلطنت کے ماتحت ایک صوبہ قرار پایا۔ اس وقت [illegible]
اب تک یہودیوں کا کبھی کوئی اپنا بادشاہ نہیں ہوا۔ سیدنا مسیح کے [illegible]
ہوتے وقت یہودیوں نے خود اقرار کیا اور کہا" قیصر کے سوا ہمارا کوئی [illegible]
نہیں" (یوحنا ۱۹: ۱۵)۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ان کا کوئی
بادشاہ نہ تھا اور سلطنت کا عصا یہوداہ کے خاندان سے جدا ہوچکا تھا۔لہذا صاف
ظاہر تھا کہ مسیح موعود آگیا۔

سیدنا مسیح کی جای ولادت کو میکاہ نے پہلے ہی بتادیا تھا (میکاہ ۵:
۲)اوراس عبارت سے یہ تعلیم بھی ملتی تھی کہ وہ محض انسان نہیں ہوگا کیونکہ
اس کے حق میں لکھاہے کہ " اس کا نکلنا قدیم سے ایامِ الازل سے ہے"اس
پیشینگوئی کا پورا ہونا متی ۲: ۱، ۵، ۶ میں بیان کیا گیا تھا۔ پیدائش ۳: ۱۵
میں اور زیادہ صفائی کے ساتھ یسعیاہ ۷: ۱۴ میں بیان کیا گیا تھا کہ وہ ایک
کنواری سے پیدا ہوگا اور پیشینگوئی متی ۱: ۱۸، ۲۵، لوقا ۱: ۲۶، ۳۸
میں پوری ہوگئی جیسا کہ قرآن بھی تسلیم کرتا ہے (سورۃ الانبیاء آیت ۹۱ ۔ سورۃ
التحریم آخری آیت)۔ اس کی تعلیم وخاکساری اور اذیت وموت کے بارے میں

اوراس [illegible] کے متعلق جو وہ بنی آدم کی [illegible] کے لئے دینے کو تھا عہدِ عتیق
[illegible] مندرج ہیں جن میں سے [illegible] بڑی یسعیاہ ۵۳: ۱، ۹،
۱۲ [illegible] ۱ تا [illegible] میں مرقوم ہیں [illegible] لوقا [illegible]: ۱۷ تا ۱[illegible] ۵۲: ۱۳ تا
۱۵ [illegible] اور ۲۲ [illegible] اس کے مار[illegible] کا وقت دانی
[illegible]
[illegible] ء کے
درمیان۔ یہ پیشینگوئی پوری ہوچکی ہے کیونکہ وہ ان مذکورہ تاریخوں کے درمیان
مصلوب ہوا۔ یعنی غالباً ۲۹ یا ۳۰ء میں یروشلیم اور ہیکل کی جس بربادی کے
بارے میں پیشینگوئی کی گئی تھی وہ دانی ایل ۹: ۲۶، ۲۷) وہ قریباً
چالیس سال کے بعد ۷۰ء میں وقوع میں آئی جبکہ رومی بادشاہ دیس پیسئن کے
بیٹے ٹائیٹس نے شہر اورہیکل دونوں کو برباد کردیا جیسا کہ یوسیفس اور دیگر
مورخین سیدنا مسیح کی پیشینگوئیوں کے مطابق بیان کرتے ہیں (متی ۲۴: ۱ تا
۲۸، مرقس ۱۳: ۱ تا ۲۳ لوقا ۲۱: ۵ - ۲۴) - ان ایام کی مصیبت
(مرقس ۱۳: ۲۴) اب تک ختم نہیں ہوئی کیونکہ یہودی اب تک تمام
رویِ زمین پر پراگندہ ہیں۔ ان کا کوئی وطن نہیں اورجیسا کہ برادرانِ اہلِ اسلام
جانتے ہیں کہ یہودی فقط اسلامی ممالک ہی میں مصیبت زدہ نہیں ہیں بلکہ روس

جیسے ممالک میں بھی مصیبت اٹھارہے ہیں ۔ علاوہ برین غیر اقوام کی میعاد بھی اب تک پوری نہیں ہوئی (لوقا ۲۱: ۲۴)۔ کیونکہ یروشلیم تاحال غیر اقوام کے قبضہ میں ہے۔

صحف انبیاء میں بہت سی ایسی عبارات مندرج ہیں جن میں سیدنا مسیح کے جی اٹھنے اور آسمان پر صعود فرماجانے اور خدا کی دائیں طرف بیٹھنے کے متعلق پیشینگوئیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً زبور ۱۶: ۱۰ (دیکھو اعمال الرسل ۲: ۲۶ تا ۳۶)۔ زبور ۱۱۰: ۱ و دانی ایل ۷: ۱۳، ۱۴، پھر دانی ایل ۲: ۳۴، ۳۵، ۴۴، ۴۵، ۷: ۷، ۹، ۱۳، ۱۴-۲۳: ۲۷ میں یہ پیشینگوئی مندرج ہے کہ اس کی سلطنت اس وقت قائم کی جائیگی ۔ جبکہ دانی ایل ۷: ۲۳ کی مذکورہ سلطنت یا رومی سلطنت ابھی حکومت کررہی ہوگی۔ چار سلطنتوں سے سلطنتِ بابل وسلطنتِ فارس وسلطنت مقدونیہ اور سلطنتِ روم مراد تھیں۔ (دانی ایل ۲: ۳۷، ۴۵-۸: ۲۰، ۲۱۔

جب سیدنا مسیح قریباً ۳۰ سال کے ہوئے توجیسا کہ اناجیل میں مرقوم ہے انہوں نے بشارت دینا شروع کیا (لوقا ۳: ۲۳) ۔ وہ نیکی کرتا پھرا۔ اس نے بہت سے معجزے کئے ۔ بہت سے بیماروں کو شفا بخشی ، دیووں کو نکالا۔ اندھوں کو بینائی اور بہروں کو شنوائی عنایت کی۔ کوڑھیوں کو پاک صاف کیا اور لنگڑوں کو چلنے کی طاقت بخشی جیسا کہ عہدِ عتیق میں یسعیاہ نبی کی پیشینگوئیوں میں مندرج ہے (یسعیاہ ۳۲: ۱، ۵، ۳۵: ۶، ۴۲: ۱ تا ۷، ۶۱: ۱ تا ۲۔ دیکھو متی ۱۱: ۴، ۵، ۔ ۱۲: ۱۷۔ ۲۱ و ۲۱: ۱۴[1])۔ اگرچہ وہ ایسا بڑا صاحبِ قدرت واختیار تھا تو بھی اس نے کبھی اپنے ذاتی فائدہ کے لئے یا اپنے دشمنوں کو سزا دینے کی غرض سے کوئی معجزہ نہیں کیا۔ اس نے افلاس وفروتنی کی زندگی بسر کی (متی ۸: ۲۰) اور دینوی عزت وحشمت کی مطلق آرزو نہ کی ۔ اس نے دنیاوی بادشاہ بننے سے انکار کیا (یوحنا ۴: ۱۵)۔ اس کے تمام افعال ایسے بے عیب تھے اوراس کی زندگی سب کی نظروں میں ایسی پاک تھی ۔ کہ اس نے اپنے مخالفوں سے کہا" تم میں سے کون مجھ پر گناہ ثابت کرتا ہے"؟ (یوحنا ۸: ۴۶)۔ اس طرح سے اس کی پہلی آمد اور چال چلن سے متعلقہ تمام پیشینگوئیاں پوری ہوئیں۔

سیدنا مسیح نے بنی اسرائیل میں سے بارہ رسول منتخب کئے اوران کی تربیت کرکے انہیں وہ تعلیم دی جو وہ ان کے وسیلہ سے اوروں کو دینا چاہتا تھا۔ وہ تعلیم جس پر اور سب باتوں کا دارومدار تھا اس کی الہٰی ابنیت کی تعلیم تھی اوراس نے خود فرمایا تھا کہ اسی تعلیم کی چٹان پر میں اپنی کلیسیا کی عمارت قائم کرونگا (متی ۱۶: ۱۳ تا ۱۸)۔

جب اس کے رسولوں نے یہ سیکھ لیا کہ وہ عہدِ عتیق کا مسیح موعود ہے توسیدنا مسیح ان کو دوسرا بڑا بھاری سبق سکھانے لگے یعنی یہ کہ اسے بنی آدم کی نجات کے لئے مصلوب ہونا اور پھر مردوں میں سے جی اٹھنا ضرور تھا (متی ۱۶: ۲۱ ومرقس ۸: ۳۱ ولوقا ۹: ۲۲) ۔ جب سیدنا مسیح کی موت کا وقت آگیا تو اس نے اپنے شاگردوں یعنی حواریوں کو اور بھی صفائی وصراحت کے ساتھ بتایا کہ وہ کس قسم کا دکھ درد برداشت کرنے کو تھا (لوقا ۱۸: ۳۱ تا

[1] سورہ آل عمران کا پانچواں رکوع بھی ملاحظہ کیجئے۔

۳۴)۔ پھر ایک موقع پر اس نے ان کو صاف بتایا کہ وہ اپنی لامحدود محبت کے سبب سے بنی آدم کو نئی اورابدی زندگی بخشنے کے لئے اپنی خوشی سے یہ سب تکالیف واذیتیں برداشت کرنے کو تھا(یوحنا ۶: ۵۱، ۱۰: ۱۱تا۱۸)۔ بشرطیکہ بنی آدم خدا کے اس مفت فضل کو قبول کریں (رومیوں ۶: ۲۳)۔

بنی آدم سے اپنی بڑی محبت کے باعث اوران کو ان کے گناہوں سے بچانے کی خاطر اس نے یہودیوں کو اجازت دی کہ اس کو پکڑ کر ٹھٹھوں میں اڑائیں اور یہودیہ کے رومی حاکم پنطس پلاطس کے حوالہ کریں تاکہ وہ اس کو کوڑے مارے او رمصلوب کرے(متی ۲۶: ۴۷-۲۷: ۵۶، مرقس ۱۴: ۴۳-۱۵: ۴۱ لوقا ۲۲: ۴۷-۲۳-۴۹- یوحنا ۱۸: ۱-۱۹: ۳۷)۔ اسی طرح سے وہ پیشینگوئیاں جو صدہاسال پیشتر حضرت داؤد زبور ۲۲) اور یسعیاہ (۵۲: ۱۳-۵۳: ۱۲)۔ نے اس کے حق میں کی تھیں پوری ہوگئیں۔

سیدنا مسیح ایسے طور پر مارا گیا کہ گویا وہ کوئی مجرم تھا اگرچہ اس کے انصاف کرنے والے پلاطس نےاس کی بے گناہی کا اقرار کیا(متی ۲۷: ۲۴) اس زمانہ میں یہودی اپنے دستور کے مطابق مجرموں کی لاشوں کو شہر یروشلیم کی فصیل کے باہر ایک مقام پر پھینکا کرتے تھے جس کا نام ھنم کے بیٹے کی وادی تھا۔ وہاں لاشیں یا تو جلادی جاتی تھیں یا گیدڑ وغیرہ کھاجاتے تھے۔ لیکن سیدنا مسیح کی لاش کے ساتھ ایسا سلوک نہ کیا گیا کیونکہ اس کی مقدس لاش ارمتیاہ کے ایک دولتمند یوسف نامی کو جودرپردہ مسیح کا شاگرد اورعالی رتبہ تھا دیدی گئی جس نے اسے اپنی نئی قبر میں دفن کیا(متی ۲۷: ۵۷تا ۶۱۔ مرقس ۱۵: ۴۲تا ۴۷ لوقا ۲۳: ۵۰تا ۵۶، یوحنا ۱۹: ۳۸تا ۴۲)۔ یہ سب کچھ بالکل اس پیشینگوئی کے مطابق وقوع میں آیا جو یسعیاہ ۵۳: ۹ میں مندرج ہے جس میں مرقوم ہے کہ اگرچہ اس کی قبر شریروں کے درمیان ٹھہرائی گئی تھی پروہ اپنے مرنے کے بعد" دولتمندوں کے ساتھ" ہوا۔

جیسا سیدنا مسیح نے پہلے ہی سے اپنے شاگردوں کو بتادیا تھا کہ میں تیسرے دن مردوں میں جی اٹھونگا (متی ۱۶: ۲۱، ۱۷: ۲۳، ۲۰: ۱۹-لوقا ۹: ۲۲،۱۸: ۳۳، ۲۴: ۷،۴۶) ویساہی وقوع میں آیا (متی ۲۸: ۱تا ۱۰ومرقس ۱۶: ۱تا ۸- لوقا ۲۴: ۱تا۴۳ یوحنا ۲۰ اورپہلا کرنتھیوں ۱۵: ۴)۔ یہ بھی حضرت داؤد کی پیشینگوئی کے مطابق وقوع میں آیا(زبور ۱۶: ۹، ۱۰)۔ جی اٹھنے کے بعد چالیس روز کے عرصہ میں وہ کئی مرتبہ اپنے شاگردوں پر ظاہر ہوا (اعمال الرسل ۱: ۳)۔ اوران کو یہ تعلیم دی کہ جو کچھ اس پر گذرا اس سے عہد عتیق کی مندرجہ پیشینگوئیاں کیسے کامل طور سے پوری ہوئیں اوراس کے دکھ اور موت اورجی اٹھنے کا اصل مطلب ومقصد کیا تھا (لوقا ۲۴: ۲۷، ۴۴، ۴۹) پھر ان کو مقرر کرکے بھیجا کہ تمام اقوام کو اس کی شاگرد بنائیں (متی ۲۸: ۱۸تا ۲۰اعمال الرسل ۱: ۸) اس کے بعد وہ ان کی نظروں کے سامنے آسمان پر صعود فرما گیا (لوقا ۲۴: ۵۰، ۵۱، اعمال الرسل ۱: ۹) اور دانی ایل نبی کی پیشینگوئی (دانی ایل ۷: ۱۳، ۱۴، ۲۷) کے مطابق شان وشوکت کے ساتھ واپس آکر ابد الاآباد تک سلطنت کرنے اور کل زمین کو علم وعرفان الہیٰ سے معمور کرنے کا وعدہ عنایت کرگیا (یسعیاہ ۱۱: ۱تا ۹، متی ۲۴: ۳۰تا ۳۱-۲۵: ۳۱تا ۴۶ مرقس ۱۳: ۲۶ ولوقا ۲۱: ۲۷ ویوحنا ۱۴: ۱تا ۳واعمال الرسل ۱: ۱۱ مکاشفہ ۱: ۷، ۲۰: ۱۱، ۲۱: ۸)۔

چونکہ وہ تمام وعدے جو خدا نے انبیایِ عہد عتیق کی زبانی مدتوں پیشتر مسیح موعود تمام جہان کے نجات دہندہ کی پہلی آمد کے بارے میں عنایت فرمائے تھے اور جن میں اسکے وقتِ ظہور اور کام اوراس کفارہ کا ذکر تھا جو وہ دینے کو تھا سیدنا مسیح میں مندرجہ بالاطور سے پورے ہوچکے ہیں اس لئے صاف ظاہر ہے کہ وہی وہ نجات دہندہ ہے جس کے حق میں انبیاء نے شہادت دی اور جس پر حضرت ابراہیم ایمان رکھتا تھا(یوحنا: ۸: ۵۶)۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ سیدنا مسیح کے حق میں پیشینگوئیوں کا پورا ہونا عہدِ عتیق کے الہامی ہونے کا بڑا بھاری ثبوت ہے کیونکہ الہام کے بغیر ان تمام واقعات اوران کے متعلقہ امور کے وقوع میں آنے سے صدہاسال پیشتر ہی کون ان کا بیان کرسکتا تھا؟عبرانی عہد عتیق جو یہود ونصاریٰ دونوں کے پاس ہے اس میں یہ سب مذکورہ بالاواقعات فی الحقیقت پیشینگوئیوں کے وسیلہ سے وقوع میں آنے سے پیشتر بیان کئے گئے تھے۔ یہودیوں نے مسیح کو تورد کردیا لیکن ان پیشینگوئیوں کا ایک لفظ بھی بدلنے یا محو کرنے کی انہوں نے کبھی جرات نہیں کی اگرچہ ان پیشینگوئیوں کے وسیلہ سے ان کی بے ایمانی اور سخت دلی پر سخت ملامت کی گئی ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسیحِ موعود کی ذات اور عظمت وشان کا بیان عہدِ عتیق میں کمال صفائی وصراحت کے ساتھ مندرج ہے۔ مثلاً زبور ۲: ۷، ۴۵: ۶ زبور ۷۲، ۱۰: ۱ یسعیاہ ۶: ۱ تا ۱۰ ۔(دیکھو یوحنا ۱۲: ۴۰، ۴۱) یسعیاہ ۹: ۶، ۷، ۲۵: ۷، ۹، ۴۰: ۱۰، ۱۱ اور یرمیاہ ۲۳: ۱۶ ومیکاہ ۵: ۲ ملاکی ۳: ۱ اور ۴: ۲ وغیرہ وغیرہ میں۔ اس حقیقت پر نظر کرنے سے کہ " اس کا نکلنا قدیم سے ایامِ الازل سے ہے"(میکاہ ۵: ۲) ہم خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا یہ قول" پیشتر اس سے کہ ابراہیم پیدا ہوا میں ہوں"(یوحنا ۸: ۵۸) کیسا راست وبرحق ہے۔ اس قول میں اس نے خدا کا خاص نام اپنے لئے استعمال کیا(خروج ۳: ۱۴) ۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ وہی تھا جس نے ابراہیم کو بابلِ سے بلایا۔ اسی نے بنی اسرائیل کو توریت عنایت کی اور اسی نے انبیاورسل کو معبوث فرمایا۔لہذا عہدِ جدید میں اس کے لئے القاب مندرجہ عہدِ عتیق سے کوئی بڑا لقب مرقوم نہیں ہے۔ اس کی ذات اور عظمت وشان پر شہادت کے بیان میں عہدِ عتیق وجدید دونوں متفق ہیں (دیکھو متی ۳: ۱۶ تا ۱۷، ۱۶: ۱۵- ۱۶: ۱۷، ۱۷: ۱ تا ۸- ۲۶: ۶۳ تا ۶۴، ۱۸: ۱۸ لوقا ۱: ۳۲ یوحنا ۱: ۱ تا ۳ - ۹- ۱۸، ۵: ۱۷ ۲۹، ۸: ۲۳، ۲۹ ، ۴۲، ۵۶، ۵۸، ۹: ۳۵، ۳۷، ۱: ۲۷، ۳۸، ۱۴: ۹تا ۱۱- ۱۶: ۱۲تا ۱۵- ۲۸، ۵:۱۷ تا ۲۹،۸: ۲۳، ۲۹، ۴۲، ۵۶، ۵۸، ۹: ۳۵تا ۳۷- ۱: ۲۷، ۳۸و ۱۴: ۹- ۱۱،۱۶: ۱۲، ۱۵، ۲۸،۱۷: ۵، ۲۱ کلسیوں ۱: ۲۱، فلپیوں ۲: ۵، ۱۱ عبرانیوں ومکاشفہ ۱: ۵- ۱۸، ۲۱: ۶، ۸، ۲۲: ۱۳ تا ۱۶ ۔) جب اہل اسلام سیدنا مسیح کو اپنا نجات دہندہ قبول کرنے کی دعوت کورد کرتے ہیں (یوحنا ۵: ۴۰) تو اس کا سبب یہ ہے کہ جو کچھ خود سیدنا مسیح نے اپنے حق میں فرمایا اور جو کچھ انبیایِ سلف نے اس کے حق میں کہا اسے سچ ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

یہ بات خوب یادرہے کہ اگر مسیح فقط ایک مخلوق انسان یا تمام مخلوقات میں بڑا مخلوق بھی ہوتا تواس کے لئے جہان کو گناہ اور خدا سے عداوت رکھنے سے بچانا بالکل ناممکن ہوتا۔ لہذا نجات کے حاصل کرنے کے لئے اس پر کامل بھروسا

رکھنا اور جو کچھ ہونے کا وہ دعویدار ہے اور جیسا اس کا عہدِ عتیق وجدید کی کتبِ مقدسہ بیان کرتی ہیں ویسا ہی ماننا ضرور ہے۔ پس اس کی الوہیت پر ایمان لانا مسیحی دین کی بدعت نہیں بلکہ دینِ حق کی جان اور روح رواں ہے کیونکہ اگر وہ مخلوق ہوتا تو اس کی نیکی اور اس کا دکھ اٹھانا بنی آدم سے خدا کی محبت کا کوئی ثبوت نہ ٹھہرتا بلکہ بخلاف اس کے اگر خدا اپنے سب سے اعلیٰ وافضل مخلوق کو اس قدر دکھ اور رنج وغم میں مبتلا ہونے دیتا تو اس کی محبت ورحمت پر ایمان لانا مشکل ہوجاتا۔ لیکن جب ہم بائبل کی تعلیم کو قبول کرتے ہیں اور پہچانتے ہیں کہ " خدا نے مسیح کے وسیلہ سے جہان کو اپنے ساتھ ملالیا"(۲ کرنتھیوں ۵: ۱۹) اور یہ معلوم کرتے ہیں کہ وہ باپ کے ساتھ ایک ہے (یوحنا ۱۰: ۳۰) تب کسی قدر سمجھنے لگتے ہیں کہ اگر" تثلیث[1] پاک کی تعلیم حق وراست ہے تو خدا ضرور رحیم ورحمان اور ہمارا خیر خواہ ہے۔ تبھی ہم معلوم کرتے ہیں کہ انجیل کا لبِ لباب اور تمام بائبل کا خلاصہ یوحنا ۳: ۱۶ میں مندرج ہے اور یہی بات ہمارے دلوں کو خدا کی محبت اور عبادت وبندگی کی طرف مائل کرتی ہے کیونکہ اس ذوالجلال نے پہلے ہم سے محبت رکھی(۱ یوحنا ۴: ۹)۔

فی الحقیقت یوحنا ۳: ۱۶ میں جو لقب ابن اللہ مسیح کو دیا گیا ہے اس سے اہل اسلام سخت ٹھوکر کھاتے ہیں کیونکہ وہ خیال کرتے ہیں کہ یہ تعلیم سورۃ الاخلاص کی مخالف ہے لیکن دراصل اس کا سبب زیادہ تر یہ ہے کہ اہلِ اسلام نے مسیحی تعلیم کو ٹھیک طور سے سمجھا نہیں۔ ہم صاف طور سے تسلیم کرتے ہیں کہ جن معنوں میں قرآن سورۃ الاخلاص کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ہم ان کو بالکل

---

[1] اس دوسرے حصے کا پانچواں باب ملاحظہ کیجئے۔

درست مانتے ہیں اور ہر ایک مسیحی[2] یہی بات کہہ سکتا ہے کہ اس سورہ میں قرآن بے دین لوگوں کی کفر آمیز تعلیماتِ تولید کی تردید کرتا ہے۔ ایسی تعلیمات بتُ پرست اقوام میں ہر جگہ رائج تھیں۔ یہاں تک کہ ایامِ جاہلیت میں اہلِ عرب بھی اسی کفر آمیز طریقے سے خدا کی بیٹیاں[3] منسوب کرتے تھے۔ لیکن مسیحی لوگ ہر گز ہر گز ایسی تعلیم کبھی متعقد نہ تھے اور اسی واسطے ہم ولد اللہ نہیں کہتے بلکہ سیدنا مسیح کو ابن اللہ کے لقب سے ملقب کرتے ہیں۔ ولد اللہ اور ابن اللہ میں بڑا بھاری فرق ہے۔ کیونکہ لفظ" ابن" کنایۃً استعمال ہوسکتا ہے اور ابن اللہ انہیں معنوں میں استعمال کیا گیا ہے لیکن لفظ ولد کنایۃ استعمال نہیں کیا جاتا۔ سنہ ہجری سے صدہا سال پیشتر کے مسیحی مصنفین نے بے دین اقوام کے جسمانی خیالات کی بار بار تردید کی اور یہ ظاہر کیا کہ مسیح کے لقب ابن اللہ کے بالکل اور ہی معنی ہیں۔ مثلاً لیکٹین ٹیپیٹس قریباً ۳۰۲ء میں سنہ ہجری سے قریباً تین سو سال پیشتر یوں لکھتاہے کہ" جو کوئی فقرہ ابن اللہ کو سنتا ہے ہر گز ہر گز اس ناپاک خیال کو دل میں جگہ نہ دیوے کہ خدا نے کسی عورت سے شادی ونکاح کے وسیلہ سے اولاد پیدا کی۔ ایسا فقط حیوانات میں ہوتا ہے جو کہ مجسم اور مرنے والے ہیں۔ لیکن چونکہ خدا واحدہ لاشریک ہےوہ کس کے ساتھ ملیگا ؟ اور چونکہ وہ ایسا قادر مطلق ہے کہ جو کچھ چاہے کرسکتا ہے اس لئے اس کو خلق کرنے کے کام میں کسی دوسرے ساتھی ک مطلق ضرورت نہیں۔

---

[2] اسی طرح سورہ انعام کے ۱۳ ویں رکوع کی پہلی آیت میں مرقوم ہے بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ أَنَّى يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُن لَّهُ صَاحِبَةٌ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍاور مسیحی لوگ اس سے بھی متفق ہیں۔

[3] سورہ انعام آیت ۱۰۰ اور سورہ انعام نحل آیت ۵۹

یہ امر بھی قابلِ ذکر اور قابل عور ہے کہ جب انجیل میں فیلسوفانہ وحکیمانہ زبان استعمال کی جاتی ہے توہمارے سیدنا مسیح کلمۃ اللہ کہلاتے ہیں(مثلاً یوحنا ۱: ۱۔ ۱۴ مکاشفہ ۱۹: ۱۳) میں دیکھو لقب " کلمہ زندگی " ۱ یوحنا ۱: ۱ میں۔ دوسرے لقب ابن اللہ کا مطلب بھی فی الحقیقت یہی ہے لیکن اس کے استعمال کے دوخاص سبب ہیں :(۱) ان سادہ لوگوں کے فائدے کے لئے جو بنی آدم میں نہایت کثیر التعداد ہیں اور کلمۃ اللہ کو سجدہ نہیں کرسکتے اور (۲)اس لئے کہ اس سے ہم کلمۃ اللہ کی شخصیت اوراس محبت کو سمجھ سکتے ہیں جو تثلیثِ مقدس کے اقانیم ثلثہ کے درمیان ہے(دیکھویوحنا ۱۵: ۹، ۱۰، ۱۷: ۲۳، ۲۶)۔ یہ دونوں آخری باتیں ایسی ہیں کہ لقبِ کلمۃ اللہ سے ان میں سے کسی کا بھی اظہار نہیں ہوسکتا۔ اس میں شک نہیں کہ انسانی الفاظ میں کامل اور ٹھیک طور سے الہیٰ ذات کے حقائق کا بیان نہیں ہوسکتا لیکن اگر ہم ان الفاظ کو استعمال کریں جن کو کتب مقدسہ میں ملہم لکھنے والوں نے الہیٰ ہدایت والہام سے لکھتے وقت استعمال کیا ہے تو اس میں ہماری کوئی غلطی یا خطا نہیں ہے۔ اگرچہ وہ باہمی رشتہ جو الہیٰ توحید کے اقانیم ثلثہ میں ہے انسانی الفاظ وخیالات سے بہت ہی اعلیٰ وبالا ہے تو بھی ہم اسے کسی قدر سمجھ سکتے ہیں۔ دریایِ لامحدود کو کوزہ میں بند کرنا امر محال ہے لیکن اس کی حقیقت سے کسی قدر آگاہی حاصل کرنے کے لئے کافی پانی کسی برتن میں بھراجاسکتا ہے۔ کلمۃ اللہ اور ابن اللہ دونوں القاب عہد جدید میں ایک ہی معنی میں استعمال کئے گئے ہیں یعنی ان کے وسیلہ سے مسیح کی الوہیت اور باپ کے ساتھ وحدت کی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے (یوحنا ۱۰: ۳۰) ۔ اس مضمون پر جو کچھ سیدنا مسیح نے خود فرمایا ہے فقط اسی پر ایمان لانے سے ہم کفارہ ونجات کی تعلیم کو سمجھ سکتے ہیں۔ وہ فرماتا ہے کہ فقط اسی کے وسیلہ سے بنی آدم خدا باپ کے پاس آسکتے ہیں (یوحنا ۱۴: ۶ دیکھواعمال الرسل ۴: ۱۲۔

عہدِ عتیق وجدید نہ فقط بالاتفاق سیدنا مسیح کو الہیٰ صفات سے متصف کرتے ہیں بلکہ نہایت صفائی اور صراحت کے ساتھ اسے خداکہکر اس کی الہیٰ ذات کا اظہار کرتے ہیں مثلاًزبور ۴۵: ۶، ۷ یسعیاہ ۹: ۶، یوحنا ۲۰: ۲۸ ، ۲۹ ورومیوں ۹: ۵ عبرانیوں ۱: ۸ ۱ یوحنا ۵: ۲۰میں یہ حقیقت صاف مرقوم ہے۔ جو کوئی یعنی آیات کا غوروفکر اور دعا ومناجات کے ساتھ مطالعہ کریگا اس پر یہ حقیقت عیاں ہوجائیگی کہ یہ عظیم الشان القاب سیدنا مسیح کو تعظیماً یا مبالغہ سے نہیں دئے گئے بلکہ اس لئے کہ وہ ایک اہم حقیقت کا اظہار کرتے ہیں جس کو جاننا بنی آدم کے لئے نہایت ضروری ہے۔

ہر ایک صاحب فہم مسلمان اس بات سے خوب واقف ہے کہ قرآن مسیح کو کلمۃ[1] اللہ کہنے میں انجیل سے متفق ہے۔ تثلیث اقدس کی بحث کے سلسلہ میں انشاء اللہ تعالیٰ ہم زیادہ شرح وبسط کے ساتھ لکھینگے ۔ اس مقام پر ہم اپنے معزز ناظرین کی توجہ اس طرف مبذول کیا چاہتے ہیں کہ اپنی آنکھوں سے تعصب کے پردہ کو اٹھا دینا چاہیے کیونکہ تعصب اکثر اوقات بنی آدم کو نورِ حق کو دیکھنے سے روکتا ہے۔ ہر ایک سچے مسلمان کو یہ ضرور ماننا پڑیگا کہ جن امور میں عہدِ عتیق وجدید اور قرآن تینوں متفق ہیں وہ ضرور حق وراست ہیں۔ یہ تینوں بہت سے امور میں متفق ہیں اور ان متفق علیہ امور میں سے وہ یہ ہیں۔ اول توحیدِ الہیٰ اور دوم یہ حقیقت کہ سیدنا مسیح کلمتہ اللہ ہے۔

---

[1] سورہ نساء آیت ۱۶۹ میں صاف ظاہر ہے کلمتہ کلمتہ اللہ کا مرادف ہے۔ دیکھو سورہ مریم آیت ۳۵ جہاں وہ قول الحق کہلاتا ہے۔

علاوہ بریں وہ کلمۃ اللہ جو ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا اور جس کلمۃ اللہ کے وسیلہ سے تمام مخلوقات وجود میں آئی (یوحنا ۱: ۱تا ۳) وہی کلمۃ اللہ مجسم ہوا اور کچھ عرصہ تک بنی آدم کے درمیان سکونت پذیر رہا (یوحنا ۱: ۱۴، فلپیوں ۲: ۵یا ۱۱) وہ یہ کھاتا پیتا اور سوتا جاگتا تھا۔ وہ انسانی رنج وراحت میں شریک ہوا اور ہماری طرح سب باتوں میں آزمایا گیا لیکن اس نے گناہ نہ کیا (عبرانیوں ۴: ۱۵، ۷: ۲۲، ۱پطرس ۲: ۲۱تا ۲۵)۔ اناجیل اربعہ سے صاف ظاہر ہے کہ وہ صاحب جسم وجان اورذی روح حقیقی انسان تھا۔ اس حقیقت کی بھی اس نے بارہا تعلیم دی اور اپنے آپ کو" ابنِ آدم" کہا۔ ابن آدم اس کا ایسا لقب ہے جو اس کی کامل انسانیت کی تعلیم دینے کے علاوہ ہم کو وہ سب کچھ یاددلاتا ہے جو اس کے حق میں پیدائش ۳: ۱۵، اور دانی ایل ۷: ۱۳ کی مندرجہ پیشینگوئیوں میں مرقوم ہے ۔ علاوہ بریں اس نے بنی آدم کا نجات دہندہ اور خدا وانسان ہو کر خدا باپ سے دعا کی اور بہت سی اور ایسی باتیں کیں جو زیادہ تر انسانی ذات سے واسطہ رکھتی ہیں۔ لیکن وہ صاحب الوہیت بھی تھا۔ وہ خدا کو اپنا باپ کہنے سے اپنی الوہیت کا اظہار کرتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ وہ باپ کا ایسا فرمانبردار ہے جیسا بیٹے کو ہونا چاہیے اور وہ اپنی الہیٰ رسالت کا بھی ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ یوں مرقوم ہے " میں آسمان سے اترا ہوں نہ اس لئے کہ اپنی مرضی کے موافق عمل کروں "(یوحنا ۶: ۳۸)۔ " باپ جس نے مجھے بھیجا اسی نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ کیا کھوں اور کیا بولوں "(یوحنا ۱۲: ۴۹)" باپ مجھ سے بڑا ہے"(یوحنا ۱۴: ۲۸) لیکن وہ بڑے زور سے خدا کی توحید کی تعلیم دے کر ہم کو شرک کے تمام خطروں سے بچاتا ہے (مرقس ۱۲: ۲۹و یوحنا ۱۷: ۳) اور نہایت صفائی سے خدا کے ساتھ اپنی وحدت کی تعلیم دیتا ہے (یوحنا ۱۰: ۳۰، ۱۷: ۲۱)۔ اسی کلمۃ اللہ وابن اللہ وابن آدم سیدنا مسیح نے ہمارے رنج وغم کو اپنے اوپر اٹھالیا۔ وہ ہمارے گناہوں کے سبب سے گھایل کیا گیا اور ہماری بدکاریوں کے باعث کچلا گیا۔ ہماری ہی سلامتی کے لئے اس پر سیاست ہوئی تاکہ اس کے مار کھانے سے ہم چنگے ہوں (یسعیاہ ۵۳: ۴، ۵) ۔ اپنی ذات میں کلمۃ اللہ ہونے سے اس نے اپنی الہیٰ عظمت پر فخر نہ کیا بلکہ اپنے اس جلال کو جو دنیا کی پیدائش سے پیشتر باپ کے ساتھ رکھتا تھا چھوڑدیا (یوحنا ۱۷: ۵)"۔ اس نے خادم کی صورت اختیار کی اور انسانوں کے مشابہ ہو گیا اور انسانی شکل میں ظاہر ہو کر اپنے آپ کو پست کردیا اور یہاں تک فرمانبردار رہا کہ موت بلکہ صلیبی موت گوارا کی۔ اسی واسطے خدا نے بھی اسے بہت سر بلند کیا اور اسے وہ نام بخشا جو سب ناموں سے اعلیٰ ہے تاکہ سیدنا مسیح کے نام پر ہر ایک گھٹنا جھکے خواہ آسمانیوں کا ہو خواہ زمینیوں کا خواہ ان کا جو زمین کے نیچے ہیں اور خدا باپ کے جلال کے لئے ہر ایک زبان اقرار کرکے کہ سیدنا مسیح خداوند ہے (فلپیوں ۲: ۷تا ۱۱)۔

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ الہیٰ ذات اور انسانی ذات کا اجتماع کیونکر ممکن ہے؟ تو ہم اس کے جواب میں یہ سوال کرتے ہیں کہ انسان میں روح وجسم یعنی فانی وباقی کا باہم مجتمع ہونا کس طرح سے ممکن ہے؟ خدا قادرِ مطلق تمام اشیا کا خالق ومالک اپنی لامحدود ودانائی وپیش بینی سے جو کچھ چاہتا ہے اسے عمل میں لانے پر قادر ہے۔ علاوہ بریں انجیل شریف سے ہم کو یہ علم بھی حاصل ہوتا ہے کہ سیدنا مسیح کی الہیٰ ذات اور انسانیت میں ایسا رشتہ ہے کہ نہ تو انسانیت الوہیت میں تبدیل ہوتی ہے اور نہ الوہیت کے انسانیت کے ساتھ

مختلط ہونے کا امکان ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ عجیب رشتہ ہماری محدود انسانی عقل میں پورے طور سے نہیں آسکتا اور فقط خدا کے پاک کلام ہی کے مکاشفہ سے ہم اس کو سمجھ سکتے ہیں لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ سیدنا مسیح میں یہ الوہیت وانسانیت کااجتماع وقوع میں آیا تاکہ خدایِ ذوالجلال کا ازلی ارادہ عمل میں آکر تکمیل تک پہنچے۔ وہ پُرفضل ارادہ یہ تھا کہ بنی آدم ہلاکت سے بچ جائیں۔ گناہ سے آزاد ہوں اور شیطان کی غلامی وایذارسانی سے نجات پائیں اور خدا سے دوبارہ میل حاصل کریں اور اس کے حضور میں ابدی نیک بختی وسعادت کی پاک برکات سے مسرور محظوظ ہوں۔ سیدنا مسیح اپنے خون کے وسیلہ سے ہر ایک قبیلے اور اہلِ زبان اوراُمت وقوم کو آزاد کرکے اپنی پاک وخودانکاری کی زندگی سے جو اس نے زمین پر بسر کی کہ ہمارے لئے پاک وبے عیب زندگی کا نمونہ ہے اور یہ نمونہ وہ اس لئے ہمارے پاس چھوڑ گیا ہے کہ ہم اس کے نقشِ قدم پر چل سکیں (یوحنا ۳: ۱۵، ۱پطرس ۲: ۲۱)۔

بعض لوگ اکثر اوقات ہم سے پوچھتے ہیں " کیا خدا بنی آدم کو آتشِ دوزخ سے فقط اپنی مرضی ومشیت سے ہی نہیں بچاسکتا تھا اور جن کو بچانا چاہتا تھا ان پر ایسی تدبیر نجات کے بغیر جیسی کہ مسیحیوں کے بیان کے موافق بائبل میں بتائی گئی ہے اپنی رحمت نہیں دکھا سکتا تھا؟ کیا اسے اپنے ارادوں کو پورا کرنے کے لئے فقط "ہوجا" کہنا کافی نہیں ہے؟

اس کے جواب میں ہم پہلے یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ سوال انسانی ذات وحالت اور روحانی ضرورت کو بالکل غلط سمجھنے اور قدسِ الہیٰ کی عظیم الشان حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہنے کے سبب سے کیا جاتا ہے۔ گناہ نہ فقط مکروہ اور ذاتِ باری تعالیٰ کے خلاف ہے بلکہ خدا کی صورت پر مخلوق انسان کی حقیقی واصلی اور روحانی ذات کے لئے بھی بالکل تباہی خیز ہے (پیدائش ۱: ۲۶، ۲۷)۔ لہذا جب تک انسان گناہ سے کلیتہً آزاد نہ کیا جائے گناہ اس کی ابدی نیکی بختی اور فرخندہ خالی کے امکان کا بالکل مانع ہے۔ گنہگاروں کو دوزخ میں ڈالنے سے باز رہنا توآسان ہے لیکن انسان کے دل ودماغ اور ضمیر وخیالات کو کس طرح سے ان گناہوں کے ہولناک کوڑھ سے پاک وصاف کیا جائے جو ماضی میں کئے اور جن کے کرنے کی حال واستقبال میں زبردست خواہش موجود ہے ؟ گناہ کوڑھ کی بد ترین صورت ہے کیونکہ وہ روحانی کوڑھ ہے۔ موت انسان کو جسمانی کوڑھ سے آزاد کردیتی ہے لیکن روحانی کوڑھ موت سے بھی دور نہیں ہوتا ۔ کیا کوئی روحانی کوڑھی ابدی زندگی سے حظ اٹھا سکتا ہے؟ کیا زندہ در گور حالت (جس میں وہ موجود ہے) کی برائی اور ناپاکی اس کو اپنی اور اوروں کی نظر میں اور سب سے بڑھ کر خدایِ پاک کی نظر میں جسے گناہ سے نفرت ہے بدحال اور قابلِ نفرت نہیں بناتی؟ موسوی شریعت یعنی توریت میں کوڑھی آدمی کے لئے بنی اسرائیل کا خیمہ گاہ میں داخل ہونا منع تھا(احبار ۱۳: ۴۵، ۴۶) اور کسی تندرست آدمی سے ملاقات کی اجازت نہ تھی۔ پس اس بات کا اور بھی کیسا کم امکان ہے کہ جس شخص کے دل اور روح میں گناہ کے کوڑھ کی ناپاکی بھری ہو وہ فردوس میں داخل ہو اور خدایِ قدوس ورب العالمین کا دیدار حاصل کرے۔ اسی واسطے کتاب مقدس میں مرقوم ہے " اس میں کوئی ناپاک چیز یا کوئی شخص جو گھنونے کام کرتا یا جھوٹی باتیں گھڑتا ہے ہر گز داخل نہ ہوگا مگر وہی جن کے نام برہ کی کتابِ حیات میں لکھے ہوئے ہیں "(مکاشفہ ۲۱: ۲۷)۔ جسمانی کوڑھ بھی ایسی بُری بلا ہے کہ نہ کوڑھی خود اسے دور کرسکتا ہے اور نہ کوئی انسان طبیب ہی اس سے شفا بخشنے کی قدرت رکھتا ہے۔ سیدنا مسیح نے بہت سے

کوڑھیوں کو جسمانی کوڑھ سے پاک وصاف کیا اور وہ روحانی کوڑھ سے بھی شفاعنایت کرسکتاہے۔ لیکن اس نے کبھی کسی جسمانی کوڑھی کو اس کی مرضی کے خلاف شفا نہیں بخشی اور وہ روحانی کوڑھ کو بھی زبردستی اور گنہگار کی مرضی کے خلاف دور نہیں کریگا۔ اگر کوئی آدمی اسی دنیا میں شہوت پرستی کرنے پر اکتفاوقناعت نہیں کرتا اوراس کی روح ایسی ناپاک ہوگئی ہے کہ اس کے نزدیک عالم آخرت میں اعلیٰ ترین نیک بختی وخوشی اس بات میں ہے ہ بہت میں ابد الآباد تک شہوت پرستی میں مصروف ومستغرق رہنے کی اجازت مل جائے تو وہ ضرور روحانی کوڑھی ہے۔ سیدنا مسیح اس کوڑھ کو دور کرسکتا ہے اور سیدنا مسیح کے سوا اور کوئی بھی اس کو دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ لیکن مسیح بھی کوڑھی کی مرضی کے خلاف اس کوڑھ سے پاک وصاف نہیں کریگا۔ فقط سچی توبہ اور مسیح پر حق ایمان کے وسیلہ سے وہ اس سے شفا حاصل کرسکتا ہے۔اسے حضرت داؤد کے ساتھ ہم آواز ہو کر یوں چلانا ضرور ہے "اے میرے خدا میرے اندر ایک پاک دل پیدا کر اور ایک مستقیم روح میرے باطن میں ڈال" (زبور ۵۱: ۱۰)۔ کوڑھی دل اور روح کو پاک وصاف کرنا۔ خیالات ومزاج کو گناہ کی محبت سے خلی کرکے پاکیزگی کی اس خوبصورتی کو قائم کرنا ہے جسے گناہ نے برباد کردیا ہے یہ کس طرح سے ہوسکتا ہے؟ خدا ہمیشہ وسائل کو کام میں لاتا ہے۔ جووسیلہ بائبل ہم کو بتاتی ہے کہ خدا نے اپنے کام کے لئے مقرر کیاہے وہ یہ ہے کہ سیدنا مسیح کلمۃ اللہ میں اپنے آپ کوظاہر کرے اور مسیح کی انسانی ذات میں بنی آدم کے غموں میں شریک ہو کر اور ان کے دکھوں کو اپنے اوپر اٹھا کر اپنی محبت کا اظہار کرے۔ وہی سیدنا مسیح جو بنی آدم کی خاطر ان کے گناہوں کے سبب سے مصلوب ہوا[1] تاکہ ان کے دلوں کو خدا کی طرف کھینچے اوراس طرح سے وہ گناہ سے نفرت کرنا سیکھیں اور گناہ کا مقابلہ کرنے اوراس پر غالب آنے کے لئے اس سے فضل وتوفیق مانگیں اور حاصل کریں۔ اس طرح سے سیدنا مسیح کے ذریعے ہر ایک سچے ایمان دار میں ایک نئی طبعیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اسے ایک پاک دل بخشتا جاتاہے اورایک مستقیم روح از سر نواس میں ڈال دیجاتی ہے۔ اس طرح سے خدایِ رحم ایسے آدمی کو مسیح کے وسیلہ سے نیا مخلوق بنادیتا ہے۔ (۲ کرنتھیوں ۵: ۱۷)۔

ہم یہ کہنے کی جرات تو نہیں کرسکتے کہ خدا گنہگاروں کو ان کے گناہوں سے کسی اورطرح سے نہیں بچا سکتا تھا لیکن بائبل سے نہایت صفائی اور صراحت کے ساتھ یہ تعلیم ملتی ہے کہ یہ وہ طریقہ ہے جس کو اس نے اپنی الہیٰ دانائی کے موافق پسند فرمایا ہے (متی ۱: ۲۱، یوحنا ۱۴: ۶)۔ کوئی اورایسا طریقہ خیال میں نہیں آتا جو اس سے زیادہ خدایِ پاک ورحیم ورحمان کی شان کے شایاں ہو۔

چونکہ مسیحی دین کی تعلم کفارہ[2] کے باب میں بہت غلط فہمی ہوتی ہے لہذا ہم یہاں پر مختصر اس کا صاف بیان کرتےہیں ۔ جس حالت میں خدا نے انسان کو پیدا کیا تھا انسان گناہ کے سبب سے اس مبارک حالت سے گرگیا اوراول آدم کے گناہ کی وجہ سے اور دوم خود نیکی کے عوض بدی کو پسند کرنے

---

[1] دیکھو ۲ کرنتھیوں ۵: ۱۴

[2] رومیوں کا خط ۵: ۱۱

کے باعث سے اس ابدی[1] زندگی کو کھو بیٹھا جو سیدنا مسیح کے وسیلہ سے عرفانِ الہٰی سے حاصل ہوتی ہے (یوحنا ۱۷: ۲)۔ پس روحانی موت سے بچنے کے لئے فقط یہی ایک طریقہ ہے کہ انسان خداوند کریم بخشندہ حیات سے نئی روحانی زندگی حاصل کرے۔ یہ زندگی سیدنا مسیح میں ہے (یوحنا ۱: ۴، ۵: ۲۶۔ کلسیوں ۳: ۴، ۱یوحنا) اور فقط اسی سے بنی آدم کو مل سکتی ہے (اعمال الرسل ۴: ۱۲)۔ سیدنا مسیح حقیقی انگور کی بیل ہے (یوحنا ۱۵: ۶)اور ایمان داروں کو ایمان کے وسیلہ سے اپنے آپ سے پیوستہ کرکے شاخیں بنالیتاہے۔ اس طرح سے وہ اپنی پاک ذات اور زندگی میں سے ان کو کچھ بخشتاہے اور گویا ان کو اپنے گوشت وخون میں شریک کرلیتاہے (یوحنا ۶: ۴۰، ۴۷، ۴۸، ۵۱، ۵۸، ۶۳)۔ اس نے انسانی ذات اختیار کی اور انسان بنا اور آدم ثانی ہوکر تمام بنی آدم کا روحانی سر اور قائم مقام ٹھہرا(یوحنا ۱: ۱۴، ۱کرنتھیوں ۱۵: ۲۲، ۴۵) ایمان کے وسیلہ سے اس کے ساتھ پیوستہ ہوکر (گلتیوں ۲: ۲۰) ایماندار خدا کے بیٹے ہونے کے حقدار بن جاتے ہیں (یوحنا ۱: ۱۲)، ۱یوحنا ۳: ۱تا۳، ۴: ۹) کیونکہ وہ روح القدس کے وسیلہ سے نئی اور آسمانی پیدائش حاصل کرتے ہیں (یوحنا ۳: ۳، ۵) سیدنا مسیح کے وسیلہ سے گناہ کی نسبت فنا ہوکر نیکوکاری کے لئے اس میں زندہ رہتے ہیں (رومیوں ۶: ۱تا۱۱)۔

اس ابدی ہلاکت سے نجات پانے کے لئے جو گناہ کا نتیجہ اوراس کی سزاہے (پیدائش ۳:۳۔ حزقی ایل ۱۸: ۲۰ورومیوں ۶: ۳)واجب تھا کہ

[1]پیدائش ۳: ۳

جس طرح سے انسان نے دیدہ ودانستہ خدا کی پاک شریعت کی خلاف[2] ورزی کی تھی اسی طرح سے اس کی کامل اطاعت وفرمانبرداری کرتا۔ کلمۃ اللہ نے کامل انسان بن کر یہ کیا۔ وہ موت تک بلکہ صلیبی موت تک فرمانبردار رہا(فلپیوں ۲: ۷، ۸دیکھورومیوں ۵: ۱۹)۔ وہ جو تمام گناہ سے پاک تھا ہمارے لئے مصلوب ہوا اور بہتوں کے لئے اپنی جان فدیہ میں دی (یسعیاہ ۵۳: ۵، ۶متی ۲۰: ۲۸ورومیوں ۳: ۲۵، ۵: ۸۔ ۱پطرس ۲: ۲۴)۔ یہ کہنا درست نہیں کہ اس نے ہمارے گناہوں کی سزا پائی کیونکہ سزا پانے کے لئے مجرم ہونا ضرور ہے اور وہ بالکل بے گناہ وبے عیب تھا (۱یوحنا ۳: ۵) بلکہ اس نے ہمارے گناہوں کے سبب سے دکھ اٹھایا اوراس کے دکھ اٹھانے کے وسیلہ سے وہ سب جو سچے دل سے اس پر ایمان لاتے ہیں گناہ اور گناہ کے آخری ہولناک نتیجہ یعنی خدا کے حضور سے دور ہونے اور ابدی ہلاکت میں پہنچنے سے بچ جاتے ہیں۔اگر مسیح محض انسان ہوتا تو وہ کامل فرمانبرداری بلکہ موت تک فرمانبردار رہنے سے اپنے آپ کو بچانے سے بڑھ کر اور کچھ نہ کرسکتا کیونکہ وہ دیگر بنی آدم کو روحانی زندگی نہ بخش سکتا۔ لیکن چونکہ وہ کامل خدا اور کامل انسان ہے اس لئے وہ ان سب کو جواس پر ایمان لاتے ہیں نئی روحانی زندگی بخش سکتا اور بخشتا بھی ہے (یوحنا ۵: ۲۶)۔ خدا غیر فانی ہے اور مر نہیں سکتا لیکن کلمۃ اللہ انسان بن کر اپنی انسانی ذات میں تمام بنی آدم کی خاطر موت کا مزہ چکھ سکتا تھا(عبرانیوں ۲: ۹)۔ وہ ہمارے لئے گناہ کے اعتبار سے ایک بار موا (رومیوں ۴: ۵، ۱۰:۶)۔ لیکن وہ موت کو فتح اور نیست نابود کرکے پھر

[2]پیدائش کا تیسرا باب۔

مردوں میں سے جی اٹھا(۲ تمیتھیس ۱: ۱۰)۔ اور جو ایمان کے وسیلہ سے اس کے ساتھ پیوستہ ہیں ان کو زندگی بخشتا ہے(یوحنا ۱۳: ۱۶، ۱۱: ۲۵، ۲۶)۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ضرور ہے کہ خدا گناہ سے نفرت رکھے کیونکہ اس کی ذات پاک ہے۔ ہم میں گناہ فقط مسیح کے وسیلہ سے خدا کی محبت کے اظہار سے مغلوب ہوسکتا ہے۔ ہم اس سے محبت رکھتے ہیں کیونکہ اس نے پہلے ہم سے محبت رکھی (یوحنا ۳: ۱۶) ۱ یوحنا ۴: ۱۹)۔ مسیح کی یہ زبردست محبت ہم کو یہ توفیق بخشتی ہے کہ ہم اس سے محبت رکھیں اور روح القدس کی مدد سے کسی حد تک اسی زندگی میں اور کامل طور پر آئندہ زندگی میں خدا کی پاک مرضی کے موافق جئیں (۲ کرنتھیوں ۵: ۱۴)۔

سیدنا مسیح کی صلیبی موت کے وسیلہ سے ہم کو دو طرح کا فضل عنایت ہوتا ہے یعنی (۱) ابدی ہلاکت سے نجات اور (۲) گناہ سے نفرت رکھنے اور اس پر غالب آنے کی توفیق (رومیوں ۶: ۵- ۱۱- کلسیوں ۲: ۲۰، ۶: ۱۴، کلسیوں ۳: ۱- ۱۷- ۱ یوحنا ۱: ۷)۔ اس نے ہم کو گناہ کی غلامی سے آزاد کیا ہے (متی ۲۰: ۲۸، ۱ کرنتھیوں ۱: ۳۰- افسیوں ۱: ۷- و ۱ پطرس ۱: ۱۸ تا ۲۱)۔ اس نے گناہ کا حقیقی اور کافی کفارہ دیا ہے (عبرانیوں ۲: ۱۷، ۱ یوحنا ۲: ۲، ۴: ۱۰)۔ یہودی شریعت میں گناہ کی قربانیاں اسی کفارہ کی نظیر و ایما تھیں۔

ہمارا ضمیر جو ہم کو گناہ سے قائل کرتا ہے اور قہر الہیٰ سے ڈراتا ہے خدا سے میل حاصل کرنے کی اشد ضرورت کی ہمیں تعلیم دیتا ہے۔ چونکہ ہم خود کامل کفارہ نہیں دے سکتے اس لئے خداوند کریم نے سیدنا مسیح کے وسیلہ سے جو کامل خدا اور کامل انسان ہے کفارہ کا انتظام کیا ہے۔ مسیح کی موت ہم پر ظاہر کرتی ہے کہ گناہ کیسا ہولناک اور گھنونا ہے مسیح کو مار ڈالنے کا جرُم دنیا کے گناہ کی حد انتہا تھا۔ خودپسندی اور خودرائی کے سبب سے آدم نے گناہ کیا۔ مسیح نے صلیب پر خودی کو موت کے حوالہ کردیا۔ مسیح کی موت اس کی جسمانی تکلیف کے سبب سے کفارہ کی موت نہیں ٹھہرتی بلکہ اس کی لامحدود محبت کے سبب سے جس سے مجبور ہو کر اس بنی آدم کے بے گناہ سرو سردار نے وہ تمام دکھ درد گوارا کیا جو دوسروں کے گناہوں کا نتیجہ تھا۔ اس نے اپنی آزاد مرضی سے (یوحنا ۱۰: ۱۷، ۱۸) ہمارے لئے اپنی جان دی اور اس طرح سے ہمارا قائم مقام اور عوض ہو کر خدا کے اس فتویٰ کے نیچے آیا جو گناہ اور گنہگاروں کے خلاف تھا (حزقی ایل ۱۸: ۲۰)۔ کفارہ میں فقط موت ہی کا خیال نہیں بلکہ زیادہ تر اس امر کا خیال ہے کہ اس نے اپنی مرضی سے خود ہی اپنے آپ کو خدا کی مرضی کے تابع کردیا اور موت تک فرمانبردار رہا۔ اگرچہ جو کفارہ اس نے ہمارے لئے دیا اس کی اصل حقیقت اسی بات میں ہے تو بھی اس نے وہ تمام رنج اور غم والم برداشت کیا جو انسانیت الوہیت کے ساتھ مل کر برداشت کرسکتی تھی۔ اس کی تکلیف فقط جسمانی ہی نہ تھی بلکہ ذہنی وروحانی بھی تھی کیونکہ بنی آدم کے گناہوں کے رنج وغم نے اس کے پُراز محبت دل کو توڑ دیا تھا(یوحنا ۱۹: ۳۴)۔ اس نے اپنے باپ کے ساتھ ایک ہونے کے سبب سے اپنی قدسیت کو اور بنی آدم کے لئے محبت سے گناہ کی کراہیت کو محسوس کیا اور اپنی انسانیت کے سبب سے ہمارے ساتھ شریک ہونے سے اس سخت لعنت کی ماہیت کو معلوم کیا جو گناہ پر سے ٹل نہیں سکتی کیونکہ خدا پاک ہے۔ اس لئے مسیح نے ہر ایک آدمی کے لئے موت کا مزہ چکھا(عبرانیوں

۲: ۹) اوراس کو اس قدر تکلیف ہوئی جو فقط بے گناہ ہی کو ہوسکتی تھی (زبور ۲۲: ۱، متی ۲۷: ۴۶، مرقس ۱۵: ۳۴)۔ اس طرح سے خدا کے عدل اوراسکی محبت ورحمت کا باہم اظہار ہوا۔

وہ جو اپنی انسانی ذات میں صلیب پر موا خدا اور انسان دونوں تھا۔ چونکہ اس نے ہمارے گناہوں کا بوجھ اپنے اوپر اٹھا لیا اور ہم گنہگاروں کے لئے صلیب پر جان دی اس لئے جو لوگ سچے ایمان کے وسیلہ سے اس سے ایسے پیوست ہوگئے ہیں جیسے انگور کی بیل سے شاخیں (یوحنا ۱۵: ۴، ۵) وہ گناہوں کی معافی حاصل کرتے ہیں اور موت کے خوف سے آزاد کئے گئے ہیں(عبرانیوں ۲: ۱۴، ۱۵) کیونکہ موت کا ڈنک گناہ ہے (۱کرنتھیوں ۱۵: ۵۶) جو غیر معافی یافتہ گنہگار کو نہایت وحشت ودہشت کے ساتھ خدا کے قہر کا منتظر بناتا ہے۔ مسیح کی قربانی کی منظوری اوراس کے کفارہ کی مقبولیت وکفایت اس سے ثابت ہوتی ہے کہ وہ مردوں میں سے جی اٹھا(رومیوں ۱: ۴) اورآسمان پر صعود فرما گیا(لوقا ۲۲: ۵۱)۔ تاکہ وہاں ہمارا قائم مقام ہو(عبرانیوں ۹: ۲۴) اوراس جلال میں داخل ہو جو وہ دنیا کی پیدائش سے پیشتر باپ کے ساتھ رکھتا تھا(یوحنا ۱۷: ۵)۔

اب ہم ان برکات میں سے بعض کا ذکر کرینگے جو اس کفارہ کا نتیجہ ہیں جو سیدنا مسیح نے دیا۔ ان میں سے پہلی بڑی برکت یہ ہے کہ خدایِ ذوالجلال سیدنا مسیح ہی کی خاطر سے خدا ان کو اپنا خاص فضل اوراپنی آسمانی ہدایت کی روشنی بخشتا ہے۔ وہ ان کے دلوں کو منور کرتاہے تاکہ اپنی اندرونی حالت کو پہچانیں اورخدا کو جانیں۔ جس نے پہلے ان سے محبت رکھی وہ ان کے دلوں کو محبت سے معمور کرکے یہ توفیق بخشتا ہے کہ روحانی قوت میں ترقی کرتے چلے جائیں تاکہ اس کے احکام کو بجالائیں اور دل کی پاکیزگی حاصل کریں اور کامل عرفانِ حق سے کامیاب وبہرور ہوں (یوحنا ۸: ۳۱، رومیوں ۵:۵، ۸: ۱۵ ۔ پہلا کرنتھیوں ۱: ۴، ۵ ، دوسرا کرنتھیوں ۶:۴ افسیوں ۱: ۱۵، ۲۳۔ فلپیوں ۴: ۱۳۔ کلسیوں ۲: ۳ ططس ۲: ۱۱، ۱۴، عبرانیوں ۹: ۱۱تا ۱۴)۔ پھر کفارہ سے ایک اور مبارک نتیجہ یہ حاصل ہوا ہے کہ مسیح نے اس کے وسیلہ سے اپنے سچے شاگردوں کو شیطان کی غلامی سے آزاد کردیا ہے۔ گناہ کی محبت سے نجات بخش دی ہے اوران کو ابدی آرام کے وارث بنادیا ہے (رومیوں ۸: ۱۲تا ۱۷، ۲ تمیتھیس ۱: ۹، ۱۰، عبرانیوں ۲: ۱۴، ۱۵، ۱پطرس ۱: ۳تا ۹)۔

اب چونکہ وہ نجات جو گنہگاروں کو سیدنا مسیح میں عنایت ہوتی ہے ایسی مبارک اور بیش بہا ہے کہ اس کے وسیلہ سے بنی آدم گناہ کی ناپاکی سے پاک ہوجاتے ہیں اوران کے لئے خدا کی خوشنودی ومہربانی کا دروازہ کھل گیا ہے اور وہ روشنی وتقدیس حاصل کرتےہیں لہذا اظہر من الشمس نصف النہار ہے کہ انجیل شریف کی تعلیمات ایسی ہیں جن سے انسان کی دلی آرزئیں جیسا کہ تمہید میں ذکر ہوا پوری ہوتی ہیں۔ پس بائبل ضرورالہامی اور کلام اللہ ہے۔

اگر کوئی آدمی نجات کی خوشخبری کو سن کر قبول نہیں کرتا تو اس کا سبب بنی آدم گناہ کی ناپاکی سے پاک ہوجاتے ہیں اوران کے لئے خدا کی خوشنودی ومہربانی کا دروازہ کھل گیا ہے اور وہ روشنی وتقدیس حاصل کرتےہیں لہذا اظہر من الشمس نصف النہار ہے کہ انجیل شریف کی تعلیمات ایسی ہیں جن سے انسان کی دلی آرزئیں جیسا کہ تمہید میں ذکر ہوا پوری ہوتی ہیں۔ پس بائبل ضرورالہامی اور کلام اللہ ہے۔

اگر کوئی آدمی نجات کی خوشخبری کو سن کر قبول نہیں کرتا تو اس کا سبب یقیناً یہ ہے کہ اس نے اپنے گناہوں سے توبہ نہیں کی اور بالکل نہیں جانتا کہ خدا کی نظر میں اس کے دل کی کیا حالت ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی خطرناک حالت سے بے پرواہوا اور اس حقیقت کو محسوس نہ کرے کہ گناہ کا ہولناک کوڑھ اس کی روح کو کھارہا ہے تو اس دوا کی تلاش وآرزو نہیں کریگا جو روحوں کا حقیقی طبیب اسے دینے کو تیار ہے۔ لیکن جو شخص اپنے دل کی گناہ آلودہ حالت سے واقف ہے اور جانتا ہے کہ خدا کی نظر میں گناہ نہایت نفرتی چیز ہے اور گناہوں کے سبب سے ہلاک ہونے کے خطرہ کو محسوس کرتا ہے کیونکہ ان کا کفارہ نہیں دے سکتا اس کے لئے اس نجات کی خوشخبری جو مسیح نے اپنے نہایت قیمتی خون سے خریدی اور جو وہ ہر ایک سچے مسیحی کو مفت دیتا ہے سب چیزوں سے زیادہ عزیز اور تسلی بخش ہے۔ یہ مفت نجات کی خوشخبری ایک ایسا مرہم ہے جس سے اس کا گناہوں کے ناقابلِ برداشت بوجھ سے خستہ وشکستہ دل پھر درست ہوسکتا ہے۔ پر اگر کوئی آدمی اپنی نفسانی خواہشات واپنے جسمانی وشہوانی جذبات کا غلام اور اسی دنیا کی محبت میں غرق ہو تو وہ بالکل تاریکی دوست شپرک کی مانند ہے جسے نورِ آفتاب سے نفرت ہے۔ ایسا آدمی انجیل کی جلالی روشنی سے دور بھاگتا ہے اور نور کو رد کرنے سے اپنے تئیں خودہی باہر کی تاریکی میں مقیم بنالیتا ہے (یوحنا ۳: ۱۹ تا ۲۱)۔ ایسے شخص کے لئے روحانی باتوں کو سمجھنا ناممکن ہے لہذا ایسے لوگوں کے نزدیک انجیل بیوقوفی ہے جیسے کہ قدیم زمانہ کے یونانیوں کی نظر میں تھی (۱ کرنتھیوں ۱: ۱۸، ۲۵، ۲: ۱۴)۔ لیکن بخلاف اس کے جو کوئی دلی آرزو کے ساتھ حق کا طالب ہے اور اللہ جل جلالہ کی پاک مرضی کو دریافت کرنا اور بجالانا چاہتا ہے اس کے لئے سیدنا مسیح کے وسیلہ سے خدا کی محبت ورحمت کا اظہار اور راہِ نجات کا مکاشفہ حقیقی مبارکبادی کا چشمہ ہے جس سے وہ اس دنیا کے ریگستان میں اپنی زندگی کا سفر کرتے وقت اپنی دلی پیاس کو بجھاسکتا ہے۔

الہیٰ تدبیر نجات میں خدا کے عدل اور اسکی محبت ورحمت وقدسیت کا نہایت صاف اظہار ہے۔ اپنی محبت کی کثرت سے انسان کو گناہ کی ہلاکت سے بچانے کے لئے خدا نے اپنا اکلوتا بیٹا اپنے جلال کی شان وشوکت مفت بخش دیا تاکہ جو کوئی اس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے۔ اس طرح سے اس بیش بہا تعلیم کے وسیلہ سے خدا کی ان صفات جلیلہ کا اظہار ہوتا ہے جن کو جاننا ہمارے لئے نہایت مناسب ہے۔ اسی تعلیم کے وسیلہ سے ہم کو معلوم کرتے ہیں کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی پاک نظر میں گناہ از حد نفرتی چیز ہے اور ہم کو ترغیب ملتی ہے کہ احکام الہیٰ کو بجالائیں اور مسیحی ایمان کی راہ پر چلیں جو ہمیشہ کی زندگی کی طرف پہنچاتی ہے۔

اصحابِ عقل وفہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ خالقِ ذوالجلال نے اپنی مخلوقات میں ہم کو اس راہِ نجات کے نظائر عطا فرمائے ہیں۔ جس طرح سیدنا مسیح نے ہمارے لئے دکھ اٹھایا اسی طرح مخلوقات میں ہمیں بہت سی نظیریں ملتی ہیں۔ بسا اوقات باپ کو خوراک وپوشاک حاصل کرنے کے لئے جس پر اس کے بچوں کی صحت وزندگی کا دارومدار ہے سخت محنت کرنا اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا ہوتا ہے۔ اکثر واقات طبیب مریض کی جان بچانے کی کوشش میں اپنی جان کو سخت خطرہ میں ڈالتا ہے اور کبھی اسی مرض میں مبتلا ہو کر مر بھی جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ہوا کے پرندے بھی گھونسلے بنانے اور انڈے سینے اور اپنے بچوں کے لئے خوراک مہیا کرنے میں سخت محنت ومشقت کرتے ہیں۔ بچوں کو

باز کے پنجوں سے بچانے کے لئے ماں اس سے لڑتی ہے اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈالتی ہے۔ خداوند کریم نے ہوا کے پرندوں اور جنگل وبیشہ کے درندوں اور چرندوں اور تمام بنی آدم کے دلوں میں اولاد کی محبت ڈالدی ہے۔ خالص اور خودغرضی سے پاک محبت اکثر اوقات خودمختاری طلب کرتی ہے لہذا اصحاب فکر کے نزدیک یہ امر عجیب اور ناقابلِ اعتبار نہیں کہ خدا نے اپنی محبت کے اظہار میں اپنے فرزندِ وحید کو بخش دیاتاکہ اس کی مخلوقات کی نجات کی خاطر دکھ اٹھائے اورمر کر پھر مردوں میں سے جی اٹھے۔

چونکہ سیدنا مسیح پر ایمان لانا اور بھروسا رکھنا وہ دوا ہے جو ہمہ دان اور قادرِمطلق خدا نے گناہ کے کوڑھ کے علاج کے لئے مقرر کی ہے اس لئے جو انسان اللہ جل شانہ کی لامحدود حکمت ودانائی پر بھروسا کرکے اس کو استعمال کرتا ہے اس کو روحانی صحت وتندرستی اور حقیقی مبارکبادی حاصل ہوتی ہے اور جس طرح سے مریض کا صحت وشفا حاصل کرنا طبیب کی تجویز کردہ دوا کے پُرتاثیر ہونیکا ثبوت ہے اسی طرح سے مسیح کا ایماندار اپنے اس نجات دہندہ پر ایمان لانے سے جس نے اس کے لئے اپنی بیش قیمت جان دی گناہ کی محبت کے مہلک مرض سے شفا حاصل کرکے انجیل شریف کے مندرجہ علاج کی اعجاز نما تاثیر کا قائل ہوجاتا ہے اورشکر گذار دل کے ساتھ اس حقیقی طبیب کی شکر گزاری وخدمت میں مشغول ہوتا ہے۔

پس سیدنا مسیح پر ایمان لانے کے وسیلہ سے گناہ سے نجات حاصل کرنا اس کی تعلیم کی سچائی اور صداقت کا نہایت صریح ثبوت ہے اور اس سے یہ بات بھی صاف ثابت ہوتی ہے کہ بائبل جو اس کے حق میں شہادت دیتی ہے کلام اللہ ہے۔

پانچواں باب

توحیدِ ذاتِ باری تعالیٰ میں الہیٰ وغیر منقسم تثلیث کی تعلیم

چوتھے باب میں جو کچھ سیدنا مسیح کے وسیلہ سے نجات کے متعلق کہا گیا ہے وہ مناسب طور پر طالب حق کی سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک وہ تثلیثِ اقدس کی تعلیم کو بغور مطالعہ نہ کرے۔ ہمارا لفظ تثلیث کو استعمال کرنا اکثر اوقات ہمارے مسلمان بھائیوں کے لئے ٹھوکر کا باعث ہوتا ہے کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ اس مضمون پر مسیحی تعلیم دراصل کیا ہے۔ لہذا وہ خیال کرتے ہیں کہ یہ خدای برحق کی وحدت کے خلاف ہے۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں بلکہ بخلاف اس کے ہم خدا کی توحید ہی کی بنیاد پر تثلیث پر ایمان لاتے ہیں۔ تمام مسیحی لوگ ایک ہی واحد خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ کہ تین خداؤں پر۔

جو کوئی سورہ مائدہ کی ۷۷ویں آیت پر جلال الدین کی تفسیر حواشی کو پڑھیگا اور سورہ نساء کی ۱۵۶ ویں آیت پر بیضاوی اور یحییٰ کی تفسیر کو ملاحظہ کریگا وہ معلوم کرلیگا کہ ان مفسرین کے وہم کے مطابق تثلیث اقدس کے اقانیم ثلثہ باپ اورماں اور بیٹا ہیں یعنی کنواری مریم طاہرہ ایک دیوی تھی اور

تین جداگانہ الہوں میں سے ایک تھی۔اس میں شک نہیں کہ حضرت محمد کے ایام میں مسیحیوں میں عام لوگ بہت بے علم اور بڑی بڑی غلطیوں میں مبتلا تھے ۔ مریم طاہرہ اورمقدس لوگوں کو پرستش کرتے تھے جیسے کہ زمانہ حال کے بے علم مسلمان اولیا کہ قبروں کی زیارت کو جاتے ہیں۔ لیکن جیسے کوئی عالم یہ نہیں کہہ سکتاہے کہ ان کا یہ فعل قرآن کی تعلیم کے موافق ہے ویسے ہی کوئی صاحب علم اب یہ خیال نہیں کرسکتا کہ حضرت محمد کے ایام کے بے علم مسیحیوں کی غلطیاں بائبل کی تعلیم کو پیش کرتی ہیں۔ قرآن حضرت مریم کی پرستش کی تردید کرتاہے اور بائبل میں کہیں اس کا جواز نہیں پایا جاتا۔ لیکن تعلیم تثلیث یا مسئلہ تثلیث سے اس کا کچھ واسطہ نہیں ہے۔ مسیحی لوگوں نے کسی زمانہ میں کبھی تین خدا[1] نہیں مانے۔

چونکہ مذکورہ بالا تین بڑے بڑے عالم مفسرین جیسے آدمی تعصب کے سبب سے اس مضمون کے متعلق گمراہ ہوگئے لہذا صاف ظاہر ہے کہ تمام اصحابِ دانش کواس اہم امر کے بارے میں بذاتِ خود کمال غور وفکر کے ساتھ تحقیقات کرنا ضروری ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ بھی غلطی میں مبتلاہوجائیں اوراس غلطی کے سبب سے حق کو رد کریں ۔ ہم مسیحیوں کے نزدیک تین خداؤں پر ایمان لانا (جن میں سے ایک کنواری مریم ہے) ایسا ہی مکروہ وہ قابلِ نفرت ہے جیساکہ مسلمانوں کے نزدیک ۔ جوکچھ اب ہم تثلیث اقدس کے متعلق بیان کرینگے اس سے ہمارے اس قول کی تصدیق وتائید ہو گی۔

[1] اس کے ثبوت میں رسولوں کا عقیدہ نیسین عقیدہ اور ریفارمڈ کلیساؤں کا عقائد نامہ ملاحظہ کیجئے۔

ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ خدا کی توحید پرایمان لانے کی تعلیم توریت میں دی گئی ہے۔ چنانچہ مرقوم ہے" سن لے اسرائیل خداوند ہمارا خداا کیلاخداوند ہے "(استشنا ۶: ۴)۔انجیل میں سیدنا مسیح انہی الفاظ کو اپنی تعلیم کی بنیاد کے طور پر اقتباس کرتاہے(مرقس ۱۲: ۱۹)۔ تعلیم تثلیث اس کی باقی تعلیمات کی بنیاد پر اس کی تشریح وتوسیع ہے مثلاً اس نے اپنے شاگردوں کو حکم دیاکہ باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو(متی ۲۸: ۱۹)۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ توحیدِ الہیٰ کی تعلیم دی گئی ہے کیونکہ لفظ نام صیغہ واحد میں ہے لیکن اقانیم ثلثہ جدا جدا بیان کئے گئے ہیں ۔" بیٹا" اور" روح القدس" مخلوق نہیں کہلاسکتے کیونکہ اس اقدس نام کی توحید میں خالق ومخلوق کو جمع کرنا درست نہیں ہوسکتا۔ علاوہ برین خدا کا بیٹا اور "خدا کی پاک روح ایسے القاب ہیں جو مخلوق پر عائد نہیں ہوسکتے ہر چند مخلوق بہت ہی عالی مرتبہ ہو۔ جو کوئی اس مضمون پر سوچیگا اسے سمجھنے میں کوئی دقتِ پیش نہیں آئیگی۔

تثلیثِ اقدس کے بارے میں مسیحی تعلیم مختصراً حسب ذیل بیان کی جاسکتی ہے:

۱۔ باپ اور بیٹا اور روح القدس ایک ہی واحد خدا ہے۔

۲۔ ان الہیٰ اقانیم ثلثہ میں سے ہر ایک کسی ایسے خاص وصف سے مختص ہے جو دوسروں میں منتقل نہیں ہوسکتا۔

۳۔ان الہیٰ اقانیم ثلثہ میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہ اگر دوسروں سے بالکل جدا کیا جائے (جو ناممکن ہے) توخودا کیلاہی خدا ہوسکے۔

۴- ہر ایک الہیٰ اقنوم دوسرے دونوں کے ساتھ ازلی وابدی اور غیر ممکن الفرق اتحاد حاصل کرکے خدا ہے۔

۵- ہر ایک الہیٰ اقنوم کی ذات وعظمت وہی ہے جو دوسرے دونوں کی ہے۔

۶- کتبِ مقدسہ میں ایک اقدس اقنوم کا مرتبہ خالق اور باپ کے القاب سے ظاہر کیا گیاہے۔دوسرے کا کلمۃ اللہ، ابن اللہ ومنجی کے القاب سے اور تیسرے کا مقدس کنندہ اور اطمینان بخشندہ ہے۔

۷- چونکہ اقدس والہیٰ اقانیم ثلثہ ذات میں ایک ہیں لہذا مرضی وارادہ وقدرت وازلیت اور تمام دیگر صفات میں بھی ایک ہیں۔

۸- پھر بائبل سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ باپ الوہیت کا سرچشمہ ہے πηγηθεοτητοδ اور ان معنوں میں بیٹے سے[1] بڑا ہے اگرچہ ذات میں دونوں ایک[2] ہی ہیں۔

اکثر کہاجاتا ہے کہ اس مسیحی تعلیم میں لفظی تناقص پایاجاتا ہے لیکن ایسا کہنا بالکل غلط ہے اوراس سے ثابت ہوتا ہے کہ کہنے والوں کو ہمارے ایمان واعتقاد کا مطلق علم نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس تعلیم میں ایک سربستہ راز ہے لیکن سربستہ راز کا ہونا امرِ دیگر ہے۔ اگر خدا کی ذاتِ اقدس رازو رموز سے خالی ہوتی یعنی اگر اس کے وجود کی ماہیت کامل طور سے اس کی محدود العقل مخلوق کے خیال وقیاس میں آسکتی اور سماسکتی تو وہ خدا نہ ہوتا کیونکہ وہ محدود ٹھہرتا۔ تعلیم تثلیث کے پُراز ہونے سے اس کی حقانیت وصداقت کے خلاف دلیل نہیں ملتی کیونکہ رازوہ ہے جس کی بابت ہم نہیں جانتے کہ کیسے ہے اگرچہ ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ ہے۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ گھاس اگتی اور بڑھتی ہے اگرچہ ہم اس کے اگنے اور بڑھنے کی ماہیت کو نہیں جانتے ۔ خدا کی مخلوقات بعید الفہم رازوں سے مملو ہے اور انسان بذاتِ خودایک راز ومعما ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ روح کس طرح مادے میں موثر ہوتی ہے لیکن وہ خود روح ہے اور کچھ عرصہ کے لئے جسم میں سکونت کرتا ہے۔ پس اگر خدا نے کتب مقدسہ میں اپنی ذات اقدس کے بارے میں چند تعلیمات درج کروائی ہیں توہم ان تعلیمات کو بعید الفہم رازوں سے خالی پانے کی توقع نہیں کرسکتے اورجب ہم یہ جانتے ہیں کہ کلام اللہ میں ان کے متعلق تعلیم موجود ہے توان کا رازواسرار سے پُر ہونا اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ ہم ان پر ایمان لانے سے انکار کریں۔ ہر ایک شخص جو غور وفکر سے بائبل کو مطالعہ کرتا ہے اسے معلوم ہوجائیگا کہ مذکورہ بالا تعلیم بائبل میں موجود ہے اگرچہ اسکا بیان انہیں الفاظ میں نہ ہو جن میں ہم نے کیا ہے۔ مثلاً تثلیث کی تعلیم فقرات ذیل میں موجود ہے جن کو تمام مسیحی لوگ بائبل کی تعلیم کے موافق ومطابق تسلیم کرینگے۔

اللہ واحد[3] ذوالحیات اور برحق ہے۔ وہ ازلی وابدی ہے ۔ وہ غیر متجسد وغیر منقسم اور غیر متاثر ہے۔ اس کی قدرت اور حکمت اور خوبی بے حد ہے۔ وہ سب مرئی اور غیر مرئی چیزوں کا خالق اور حافظ ہے۔اس وحدتِ الہیٰ میں تین اقانیم یعنی باپ اور بیٹا اور روح القدس ہیں جو جوہر وقدرت اور ازلیت میں ایک ہی ہیں۔

[1] یوحنا ۱۴: ۲۸

[2] یوحنا ۱۰: ۳۰

[3] کلیسیائے انگلستان ۳۹ مسائلِ دین میں سے پہلا مسئلہ۔

یہ فقط کتبِ مقدسہ کے موافق ومطابق نہیں بلکہ قدیم مسیحی مصنفین کی تصانیف جوہم تک پہنچی ہیں ان سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی بالکل ہماری طرح سمجھا تھا کہ بائبل تثلیث فی التوحید کی تعلیم دیتی ہے۔

عقل خود ہم کو بتلاتی ہے کہ ہم ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتے مگر وہی جو اللہ جل شانہ نے خود ہم پر منکشف فرمادیا ہے۔چنانچہ داناؤں نے خوب کہا ہے البحث عن ذات اللہ کفر یعنی خدا کی ذات کے بارے میں بحث کرنا کفر ہے۔

ہمارے بعض مسلمان بھائی کہتے ہیں کہ توحید الہیٰ کی تعلیم تثلیث پر ایمان لانے کی مخالف ومانع ہے۔ لیکن چونکہ یہ دونوں طرح کی تعلیم یعنی تعلیم توحید اور تعلیم تثلیث کلام اللہ میں موجود ہیں لہذا ان میں حقیقی باہمی تناقض ناممکن ہے۔ وحدت کا خیال ہر طرح کی کثرت کا منافی ومانع نہیں ہے۔ مثلاً سب تسلیم کرتے ہیں کہ خدا میں عدل ورحمت اور قدرت وحکمت وغیرہ صفات کی کثرت موجود ہے ۔ فی الحقیقت علمایِ اسلام یہ صحیح ودرست تعلیم دیتے ہیں کہ وہ مجمع الصفات الحسمہ وجامع صفات کمال [1] ہے۔ لیکن صفات کی کثرت وحدتِ الہیٰ کی متناقض نہیں ہے۔ اسی طرح سے وحدتِ ذاتِ باری تعالیٰ میں اقانیم ثلثہ کا وجود توحید کا مخالف نہیں ہے کیونکہ توحیدِ الہیٰ پر ایمان لانا دین حق کی بنیاد ہے۔ ہم یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ مخلوقات میں اللہ جل شانہ کی ذاتِ پاک کی کوئی کامل مثال نہیں ملتی لیکن ہماری محدود وعقل کے لئے ناکامل مثالیں فائدہ مند ہوسکتی ہیں۔ توریت میں مرقوم ہے کہ خدایِ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا (پیدائش ۱: ۲۷)اور حضرت علی ابن ابی طالب کا پرُاز حکمت قول بھی اسی کے موافق ومطابق ہے من عرف نفسہ فقد عرف ربہ یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ لہذا ہم ذیل کی ناکامل مثال پیش کرسکتے ہیں۔ ہر ایک آدمی ایک واحد شخصیت ہے توبھی وہ اپنی روح اور عقل اور اپنے نفس کے لحاظ سے بہر سہ صورت اپنے آپ کو میں کہہ سکتا ہے۔ یہ تینوں چیزیں کسی حد تک ایک دوسری سے جدا جدا ہیں کیونکہ عقل نفس نہیں ہے اور نہ ان دونوں میں سے کوئی روح ہے۔ توبھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان تینوں میں سے ہر ایک کو شخصیت کہنا نادرست ہے اگر چہ شخصیت ایک ہے نہ کہ تین ۔ فی الحقیقت ان تینوں میں سے کوئی ایک دوسری دونوں سے جدا کامل شخصیت نہیں ہے توبھی ایسے طور سے متحد ہیں کہ تینوں کے باہم ملنے سے شخصیت بنتی ہے اور کم از کم اس زندگی میں ان میں جدائی بھی ناممکن ہے یہ ہماری انسانی ذات کے بہت سے اسرار میں سے ایک سر ہے۔ ہم اس کو سمجھ نہیں سکتے توبھی ہم اس کے وجود کے قائل ہیں۔ ہر ایک فرد بشر ایک واحد شخص ہے تو بھی وہ اپنی ذات میں مذکورہ بالا امتیاز کو محسوس کرتا ہے جو اس کی واحد شخصیت کا متناقض نہیں ہے۔ ہم اس مثال کو الہیٰ تثلیث فی التوحید کی صداقت کے ثبوت کے طور پر پیش نہیں کرتے۔ تثلیث فی التوحید کی تعلیم کا ثبوت جیسا کہ ہم پہلے بیان کرآئے ہیں بائبل میں ہے اور خاص طور پر عہد جدید یعنی انجیل شریف میں پایا جاتا ہے۔اس تعلیم کو ہم اس لئے قبول کرتےہیں کہ وہ الحق کے وسیلہ سے کلیتہً الہیٰ مکاشفہ سے ظاہر کی گئی ہے ۔ اب ہم فقط یہ دکھلانے کی کوشش کررہے ہیں کہ جوچند دلائل عموماً اس تعلیم کی مخالفت میں لوگ پیش کرتے ہیں وہ اس کی تردید کے لئے کافی

[1] میزان الموازین صفحہ ۱۴ پر مرقوم ہے "خدایِ صافع ماازکل جہالت کامل است یعنی تمامی صفاتِ کمالیہ رابطور اکمل درمقام موصوفیہ عنوان ذاتش موجود بدانیم۔

نہیں بلکہ بخلاف اس کے وہ دلیلیں خدا کی ذات پاک کے بارے میں مسیحی تعلیم کو غلط سمجھنے کے سبب سے پیش کی جاتی ہیں لہذا ہمارا فرض ہے کہ اس تعلیم کو ٹھیک طور سے سمجھانے کی کوشش کریں اور اپنے مسلمان بھائیوں کی راہ سے ان رکاوٹوں میں سے ایک کو دور کریں جو ان کو عرفان الہیٰ سے روکتی ہیں۔

یہ امر نہایت ہی قابل غور ہے کہ قرآن خدا کا ذکر کرتے وقت فعل اور ضمیر کو صیغہ جمع متکلم میں استعمال کرنے میں توریت سے اتفاق کرتا ہے۔ توریت میں صیغہ جمع متکلم کا استعمال بہت کم ہے اگرچہ اس کی مثالیں پیدائش ۱: ۲۶، ۳: ۲۲، ۱۱: ۷ میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن قرآن میں اس صیغہ کا استعمال بہت کثرت کے ساتھ پایا جاتا ہے مثلاً سورہ علق میں جو بعض کے نزدیک قدیم ترین وحی ہے جس کا نزول حضرت محمد پر ہوا اگرچہ خدا کے آٹھویں آیت میں لفظ رب اور چودھویں آیت میں اللہ آیا ہے اور یہ دونوں الفاظ صیغہ واحد میں ہیں تو بھی اٹھارہویں آیت میں مرقوم ہے سندع الذبانیۃ یعنی ہم بلاتے ہیں پیادے سیاست کرنے کو۔ اس آیت میں سندع صاف صیغہ جمع متکلم ہے۔ چونکہ بائبل اور قرآن دونوں اس قسم کی زبان کے استعمال میں متفق ہیں لہذا یہ امر بے معنی خالی از مطلب نہیں ہے۔ یہودی اس کو یوں سمجھا تے ہیں کہ خدا فرشتوں سے مخاطب ہو کر بول رہا تھا لیکن توریت کی آیات مندرجہ بالا میں یہ معنی ٹھیک نہیں بیٹھتے اور قرآنی عبارت میں تو اس قسم کی تاویل کی مطلق گنجائش نہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ خدا کو جمع کا صیغہ استعمال کرنے سے اپنی عظمت وشان کا اظہار منظور تھا تو اس سے بھی حقیقی محقق کا کامل تسلی نہیں ہوتی مندرجہ بالامقامات میں صیغہ جمع کی تفسیر کرنا ہم پر فرض نہیں ہے لیکن یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اگر تعلیم تثلیث کو جیسا کہ ہم اس کا بیان کرچکے ہیں قبول کرلیا جائے تو خدا کی توحید پر ایمان اور قرآن میں خدا کے لئے صیغہ جمع متکلم کے درمیان باہمی موافقت ومطابقت بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔

اگرچہ مخلوقات کی کوئی مثال ذات باری تعالیٰ کی کامل تفہیم کے لئے کافی نہیں ہے تو بھی جو مثال ہم اوپر درج کرچکے ہیں اس کے علاوہ اور بہت سی ایسی مثالیں ہیں جن سے یہ ظاہر ہوسکتا ہے کہ کئی طرح کی کثرت ایسی بھی ہے جو حقیقی وحدت کی متناقض نہیں کہلاسکتی۔ مثلاً نور آفتاب کی ہر ایک سفید شعاع میں مختلف قسم کی تین شعاعیں موجود ہیں یعنی (۱) روشنی کی شعاع (۲) گرمی کی اور (۳) کیمیائی فعل کی لیکن پھر بھی تینوں ایسے طور پر ایک دوسری سے جدا نہیں کی جاسکتیں کہ تین جداگانہ شعاعیں بن جائیں بلکہ بخلاف اس کے سفید شعاع کی وحدت اپنے اندر تینوں شعاعوں کے وجود کی متقاضی ہے۔ اس مثال کو ایک اور طرح سے بھی پیش کرسکتے ہیں۔ آگ اور روشنی اور گرمی تین چیزیں ہیں لیکن پھر بھی تینوں ایک ہی چیز ہیں۔ روشنی اور گرمی کے بغیر آگ کا وجود قائم نہیں ہوسکتا۔ روشنی اور گرمی کی ذات واصل وہی ہے جو آگ کی ہے بلکہ ان کا وجود بھی اسی وقت سے ہے جب سے آگ کا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آگ روشنی اور گرمی دیتی ہے اور گرمی وروشنی کی پیدائش آگ سے یا گرمی وروشنی کا صدور آگ سے ہے لیکن اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ گرمی وروشنی کو کبھی آگ سے جدا کرسکتے ہیں اور جس وقت گرمی یا روشنی آگ سے نکلتی ہے اس وقت آگ میں نہیں بلکہ اس سے خارج ہے۔ اسی طرح سے ذہن وخیال اور گویائی ایک ہیں لیکن پھر بھی تینوں میں باہمی امتیاز ہے۔ ہم خیال سے بالکل خالی ذہن کا تصور نہیں کرسکتے اور خیال میں کلام یا گویائی موجود ہے خواہ وہ کلام ملفوظ ہو خواہ غیر ملفوظ۔ اس سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کثرت

کی بعض صورتیں وحدت کی مخالف نہیں ہیں اور بہت سی ایسی اشیا موجود ہیں جن کی ذات ہی الکثرت فی الوحدت ہے۔

لہذا ہم صاف اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ توحیدِ ذات باری تعالیٰ میں اقانیم ثلثہ کا وجود ضمیر منیر کا مخالف نہیں ہے بلکہ بخلاف اس کے خالقِ کون ومکان کی مخلوقات میں ایسی نظیریں موجود ہیں جن سے اس کی تائید وتصدیق ہوتی ہے اور کلام اللہ میں بھی اس کی تعلیم دی گئی ہے۔

اس تعلیم کے متعلق ایک اور بات پر غور کرنا بھی ضرور ہے ۔اہل اسلام کے درمیان افضل ترین اسمایِ الہیٰ میں سے ایک الودود[1] ہے ۔ یہ اسم بائبل کی بہت سی عبارات سے کامل موافقت ومطابقت رکھتا ہے۔ مثلاً یرمیاہ ۳۱: ۳، یوحنا ۳: ۱۶ - ۱ یوحنا ۴: ۷ تا ۱۱ سے خدا کی ذات لاتبدیل وغیرہ متغیر ہے۔ پس جیسا وہ اب الودود یعنی محبت کرنے والا ہے ہمیشہ سے ویسا ہی ہے یعنی الودود (محبت) کی صفت اس کی الہیٰ ذات میں ازل ہی سے موجود ہے لیکن محبت کے لئے محبوب کا ہونا لازم ہے۔ خلق عالم سے پیشتر واجب الوجود کے سوا اور کچھ بھی موجود نہ تھا۔ پس جب تک ہم اس ملحدانہ خیال کے ماننے والے نہ ہوں کہ غیر متغیر ذاتِ باری تعالیٰ میں تغیر واقع ہوا اور وہ مخلوقات کو خلق کرنے کے بعد محبت کرنے لگا ہم کو مجبوراً تسلیم کرنا پڑیگا کہ وحدتِ الہیٰ میں کم از کم وادومود یعنی محب ومحبوب موجود ہیں۔ یہ عقلی نتیجہ ہے اور یوحنا ۱۷: ۲۴ کے موافق ومطابق ہے جہاں کلمۃ اللہ باپ سے یوں کہتا ہے " تونے بنایِ عالم سے پیشتر مجھ سے محبت رکھی" یہ تعلیم کہ وحدت

---

[1] سورۃ البروج ۱۴ ویں آیت۔ نیز مشکواۃ المصابیح کتاب اسمایِ الہیٰ فصلِ دوم صفحہ ۱۹۱، ۱۹۲ کوملاحظہ کیجئے۔

ذاتِ الہیٰ میں تین اقانیم ہیں جن کا جوہر اور جن کی قدرت اور ازلیت ایک ہی سے فقط ایک ہی ایسی تعلیم ہے جس کے وسیلہ سے خدا میں صفتِ محبت کا وجود ایسے طور سے مانا جاسکتا ہے کہ اس کی غیر متغیر ذاتِ ہمارے ایمان کے مطابق ٹھہرے جس نے خود فرمایا ہے" میں خداوند ہوں میں بدلتا نہیں"(ملاکی ۳: ۶)۔

لیکن شائد کوئی یہ پوچھتے کہ تثلیثِ اقدس کی تعلیم کو ماننے سے کونسا فائدہ مقصود ہے؟ اس کے بہت سے جوابات ہیں جن میں سے چند ایک ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

۱۔ اس تعلیم کو ماننا خدا کو الکافی والصمد (سورۃ الاخلاص آیت دوم) اور غیر متغیر ماننے کی راہ سے تمام عقلی مشکلات کو دور کردیتا ہے جو کچھ ہم ابھی بیان کرچکے ہیں اس سے بھی یہ بات صاف ظاہر ہے۔ لہذا عقل اس تعلیم کی متقاضی ہے۔

۲۔ اس کے وسیلہ سے ہم تعلیم بائبل کو قبول کرسکتے ہیں اور قرآنی تعلیمات کے بعض حصص کو سمجھ سکتے ہیں۔

۳۔ اس تعلیم کے وسیلہ سے ہم مسیح کے کلمۃ اللہ ہونے کے دعویٰ کو قبول کرسکتے ہیں جو انجیل وقرآن دونوں میں مندرج ہے۔ یہ لقب (کلمۃ اللہ سورہ نساء ۱۶۹ ویں آیت اور قول الحق سورہ مریمہ ۳۵ ویں آیت)۔ اس کی ذات کی ماہیت اور اس کے مرتبہ کو ظاہر کرتا ہے اسی واسطے کلام اللہ میں وہ اس سے ملقب کیا گیا ہے۔ لفظ کلمۃ یونانی Λογοδ متکلم کے مانی الضمیر کے اظہار پر دلالت کرتا ہے اور اس مقام پر متکلم خود خدا ہے۔ اگر مسیح فقط خدا کا ایک کلمہ ہوتا تو وہ اس کی مرضی کا محض ایک اظہار ٹھہرتا لیکن چونکہ خدا خود اس کو الکلمۃ

اللہ کہتا ہے کہ لہذا صاف ظاہر ہے کہ وہ خدا کی مرضی کا کامل اظہار اور خود خدا کا کامل مظہر ہے ۔ اسی کے وسیلہ سے انبیا نے کلام کیا جبکہ اس نے ان کو منور کرنے کے لئے روح القدس کو بھیجا (لوقا ۱۰: ۲۲، یوحنا ۱: ۱، ۲، ۱۸، ۱۴: ۶ تا ۹ - ۱ پطرس ۱: ۱۰ تا ۱۲)۔ پس چونکہ لقب کلمۃ اللہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فقط مسیح ہی خدا کو بنی آدم پر ظاہر کرسکتا ہے لہذا ضرور ہے کہ وہ خود خدا کو اوراس کی مرضی کو کامل طور سے جانے (جیسا کہ یوحنا ۸: ۵۵، ۱۰: ۱۵ میں وہ خود فرماتا ہے)۔ اس میں وہ ماعر[1] فناک حق معرفتک کہنے والے سے متفق نہیں ہے۔ مسلمان علمایِ دین[2] تسلیم کرتے ہیں کہ خدا کی ذات پاک ایسی ارفع واعلیٰ ہے اور واجب الوجود کی حقیقت ایسی برتروبالا ہے اور اس کی کنہ وماہیت ایسی بعید الفہم ہے کہ عرفا وحکما اور اولیا اونبیاء بھی اس کے عرفان وادراک سے عاجز قاصر ہیں۔ لہذا کلمۃ اللہ کے بغیر خدا کے اظہار ومکاشفہ کا کوئی امکان نہیں۔ پس کلمۃ اللہ کے بغیر خدا کے اظہار ومکاشفہ کا کوئی امکان نہیں ۔ پس کلمۃ اللہ جو اللہ جل شانہ کو کامل طور سے جانتے ہیں محض مخلوق نہیں ہوسکتے کیونکہ بعض مخلوق خواہ وہ بزرگترین فرشتگان سے بھی بزرگتر ہو خدا کو کامل طورسے نہیں جان سکتا۔ خدا کو خود ہی پورے سے طور جان سکتا ہے کیونکہ واقفِ اسرار نہانی خدا کے سوا کوئی انسان کے خیالات کو بھی پورے طور سے جاننے کی قدرت نہیں رکھتا۔ پس ہم صاف دیکھتے ہیں کہ عقل کلمۃ اللہ کی الوہیت کا تقاضا کرتی ہے۔ تثلیث اقدس کی تعلیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں عقل

[1] قول حضرت محمد منقول ودہدایۃ الطالبین صفحہ ۲۲

[2] ہدایۃ الطالبین صفحہ ۱۰

بالکل درستی پر ہے۔ پس اس طرح سے اس کے وسیلہ سے ہم سیدنا مسیح کے دعوئے کو حق تسلیم کرتے ہیں اور جو نجات وہ بخشتا ہے اسے قبول کرسکتے ہیں۔

۴۔ الہٰی تثلیث فی التوحید پر ایمان لانا سخت ولاتبدیل قسمت پر احمقانہ وپرازیاس اعتقاد رکھنے کی بیخ کنی کرتا ہے۔ قسمت کی تعلیم سے ہندو اور مسلمان دونوں برابر آزردہ ہیں۔ یہ قسمت پر ایمان رکھنا اس مردہ دلی وبے پروائی کے خاص اسباب میں سے ہے جن کی وجہ سے اسلامی اقوام ترقی کے میدان میں بہت پیچھے رہ گئی ہیں اور اسی سبب سے تمدن وتہذیب میں انہوں نے مسیحی اقوام سے بہت کم ترقی کی ہے۔ اہلِ عرب وفارسی اور مصری وترک عقل وشجاعت اور الوالعزی میں ہر گز ہر گز یورپی اقوام کی طرح نہیں ہیں۔قدیم تواریخ نے اس حقیقت کے ثبوت میں کچھ بھی شک وشبہ کا امکان باقی نہیں چھوڑا اگر وہ عقیدہ تقدیر کے معتقد نہ ہوتے توضرور نئی قوت حاصل کرتے ۔ جب ہم یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ خدا نے ہم سے اس قدر محبت رکھی ہے کہ اس نے اپنے آپ کو کلمۃ اللہ میں ظاہر کیا۔ جس نے ہماری خاطر انسان بن کرہمارے درد وغم کو خود برداشت کیا اورہماری ہی خاطر زمینی زندگی اختیار کی اور مر کر پھر جی اٹھا اوراب ہم خدا پر بھروسہ اور توکل کرسکتے ہیں کیونکہ ان سب باتوں سے ہم پر اس کی محبت ثابت ہوتی ہے (یوحنا ۳: ۱۶، ۱ یوحنا ۴: ۷، ۱۶)۔ہمارے مسلمان بھائی سیدنا مسیح کو قبول نہیں کرتے۔لہذا اگر وہ غور وفکر کو کام میں لائیں توان کو صاف معلوم ہوجائے گا کہ وہ ہر گز ہر گز خدا کو جان نہیں سکتے ۔ اسی واسطے ملکِ مصر میں آج کل یہ مثل مروج ہے کل ماخطر فی بالک فھو حالک واللہ بخلاف ذلک یعنی جو کچھ تیرے دل میں گذرا وہ تیرا ہی حال ہے اور اللہ کے سوا کچھ اورہی ہے۔ اس طرح سے اسلام خدا سے ناواقفیت

اورلاعلمی کی طرف لیجاتاہے لیکن مسیحی لوگ حقیقی مظہر الہیٰ پر ایمان لانے سے خدا کو جان سکتے ہیں اوراس سے محبت رکھ سکتےہیں جس نے پہلے ہم سے محبت رکھی(۱ یوحنا ۴: ۱۹)۔اس کی پاک روح ہمیشہ سچے مسیحیوں کے ساتھ رہتی ہے اوران کے دلوں کو اس کا مسکن بناتی ہے اوران کو قربتِ الہیٰ اور عرفانِ حق میں ترقی بخشتی ہے (یوحنا ۱۴: ۱۶تا ۱۷-۱: ۲۶، ۱۵: ۲۶، ۱۶: ۷، ۱۵ اوعمال الرسل ۱: ۵، ۲: ۱-۴- ۱کرنتھیوں ۳: ۱۶، ۱۷، ۶: ۱۹)۔ پس وہ خدا سے میل حاصل کرکے اس سے ایسی رفاقت رکھتے ہیں جیسی کہ پراز محبت آسمانی باپ سے بیٹوں کو حاصل ہوسکتی ہے اوراس کے حضور میں کانپتے اور تھرتھراتے نہیں جیسے کہ کسی قہارمالک کے حضور میں غلام کانپتے اور تھراتھراتےہیں۔

پس ہم بائبل سے یہ علم حاصل کرتےہیں کہ خدا نے اپنے آپ کو ہم پر ظاہر فرمایاہے (۱) اس پرازُ شفقت ومحبت باپ کی مانند جو اگرچہ اپنی کامل قدوسیت کی وجہ سے گناہ سے نفرت رکھتاہے تو بھی اس نے اپنی محبت ورحمت کی فراوانی کے مطابق ازل ہی سے ارادہ کیا کہ ایک خاص طریقہ وتدبیر کے وسیلہ سے تمام بنی آدم کو بشرطیکہ کہ وہ اس کے مفت فضل کو قبول کرنے کے لئے رضامند ہوں گناہ سے بچائے اور دل ودماغ اور مرضی واخلاق کے لحاظ سے اپنے آپ سے ملالے۔ (۲) یہ اظہار خدا نے اپنے کلمة وفرزندِ توحید کے وسیلہ سے فرمایا جس کے وسیلہ کے بغیر کوئی مخلوق آسمانی باپ کو جان نہیں سکتا۔ کلمة اللہ نے انسان بن کر ہمارے رنج وغم کو خود اٹھالیا۔اس نے صلیب پر جان دی اور ہم کو راستباز ٹھہرانے کے لئے پھر جی اٹھا رومیوں ۴: ۲۵)۔(۳) تاکہ بنی آدم اس نجات کو قبول کریں جو کلمة اللہ نے ان کے لئے تیار کی ہے اللہ جل شانہ نے روح القدس یعنی تثلیث اقدس کے اقنومِ ثالث کو بھیجا کہ بنی آدم کو گناہ سے قائل کرے اور نجات دہندہ کی ضرورت کو دکھلائے اور بیش بہا انجیل کے فرمان سے ان کے دلوں کو روشن کرکے ہمیشہ کی زندگی کی تلاش وتحصیل اورمبارکبادی تک پہنچائے۔

یہ بھی یادرہے کہ تثلیثِ اقدس کی تعلیم کا ثبوت وہی ہے جس پر موت وقیامت اور دیگر ایسی تعلیمات کی بنیاد ہے جن کے وسیلہ سے خدا کے دیندار بندے تمام بے دین وبُت پرست سے تمیز کئے جاتے ہیں۔ یہ تمام تعلیمات کلام اللہ میں مندرج ہیں۔

اب ہم نہایت اختصار کے ساتھ اس امر کا بیان کرینگے کہ ہم کس طرح اپنے دلوں میں اس کی نجات کو محسوس کرسکتےہیں جو سیدنا مسیح ہم کو دیتےہیں اوراس کےوسیلہ سے ابدی زندگی(یوحنا ۱۷: ۱تا ۳) اور تمام دیگر بڑی بڑی برکات جو خدا اپنے بندوں کو دینے کے لئے تیار ہے کیونکہ حاصل کرسکتے ہیں۔

عہدِ جدید یعنی انجیل شریف کی تعلیم کے مطابق یہ فقط سیدنا مسیح پر زندہ ایمان وتوکل کے وسیلہ سے ہوسکتاہے(اعمال الرسل ۴: ۱۲، ۱۶: ۳۱، ۱یوحنا ۳: ۲۳) کہ ہم بیان سے باہر خوشیوں اور برکتوں اور ان چیزوں کے وارث ہوں جو آنکھوں نے دیکھیں نہ کانوں نے سنیں اور نہ آدمی کے دل میں آئیں۔ وہ سب خدا نے اپنے محبت رکھنے والوں کے لئے تیار کیں (۱کرنتھیوں ۲: ۱۹)۔ مسیح پر ایمان لانے سے فقط یہی مراد نہیں ہے کہ اس کی تعلیم کو برحق تسلیم کریں بلکہ اس سے اس زندہ وپرُمحبت نجات دہندہ پر کامل بھروسا اور توکل مراد ہے جو گنہگاروں کو ان کے گناہوں سے بچانے کے

لئے دنیا میں آیا(۱ تمیتھیس ۱: ۱۵، متی ۱: ۲۱)۔ اور جو ان سب کو جو اس کے وسیلہ سے خدا کے پاس آتے ہیں آخر تک بچاسکتا ہے (عبرانیوں ۷: ۲۵)۔ ایسا زندہ ایمان ہم کو روحانی طور پر مسیح سے پیوستہ کرتا ہے(یوحنا ۱۵: ۴تا ۱۰)۔ اوراس کے وسیلہ سے خدا کو فرزند بناتا ہے (یوحنا ۱: ۱۲، ۱۳، ۱ یوحنا ۳: ۱تا ۱۲)۔ ایسا ایمان ہم کو گناہ سے چھوٹنے اور شیطان کی غلامی[1] سے آزاد ہونے کی طاقت بخشتا ہے اورہم قدرت پاتے ہیں کہ تاریخی[2] کے کاموں کو اتار پھینکیں اور جس پاک بلاہٹ سے ہم بلائے گئے ہیں اس کے لائق زندگی بسر کریں اور نور کے فرزندوں کی مانند روشنی میں چلیں(۱ یوحنا۸: ۱۲، ۱۲: ۳۵، ۳۶)۔

لیکن چونکہ انسان اپنی طاقت سے سیدنا مسیح پر ایسا زندہ ایمان نہیں لاسکتا اس لئے خدا نے بنی آدم سے اپنی لامحدود محبت کے تقاضے سے روح القدس کا فضل عنایت کیا ہے تاکہ اس کی فیض رساں تاثیر سے روحانی زندگی حاصل کریں اور مسیح پر ایمان لانے کی قوت پائیں بشرطیکہ ہم اس کی پراز رحم تاثیر کی مخالفت نہ کریں۔

ہم دریافت کرچکے ہیں کہ سیدنا مسیح کلمۃ اللہ ہے یعنی فقط وہی ذاتِ باری تعالیٰ کا حقیقی مظہر ہے۔ لہذا صاف ظاہر ہے کہ فقط اسی کے وسیلہ سے انسان کی خدا تک رسائی ہوسکتی ہے (یوحنا ۱۴: ۶)۔ پس جب تک انسان سیدنا مسیح پر ایمان نہ لائے خدا کا مقبول نظر نہیں ہوسکتا اور اپنے گناہوں کی معافی حاصل نہیں کرسکتا۔ لہذا روح القدس سے بنی آدم کو یہ ترغیب ملتی ہے کہ بے ایمانی اور دیگر گناہوں سے توبہ کریں اورجو نجات سیدنا مسیح مفت دیتے ہیں اسے قبول کرکے گناہوں سے بالکل دست بردار ہوں۔ روح القدس ہمارے دلوں کی بُری حالت کو ہم پر ظاہر کرتا ہے۔ہمارے گناہوں سے ہم کو قائل کرکے مجرم قرار دیتا ہے اور آنے والی عدالت سے متنبہ کرتا ہے (یوحنا ۱۶: ۸) وہ ہم کو ترغیب دیتا ہے کہ مسیح کے کفارہ کے وسیلہ سے خدا سے میل حاصل کریں (عبرانیوں ۱۰: ۱۰تا ۱۴)۔ جو لوگ روح القدس کی پُر فضل ہدایت کی پیروی کرتے ہیں سیدنا مسیح پر ایمان لانے کے وسیلہ سے راستباز ٹھہرتے ہیں اوراس کے وسیلہ سے ان کی خدا سے صلح ہوجاتی ہے (رومیوں ۵: ۱)۔ وہ ان کو وہ اطمینان ودلی آرام بخشتا ہے جو دنیا نہیں دے سکتی (یوحنا ۱۴: ۲۷)۔ تب تائب گنہگار اس خوف ودہشت سے آزاد ہوجاتا ہے جسے وہ پہلے اپنے گناہوں کے سبب سے محسوس کرتا تھا اور وہ بوجھ جو پہلے پہاڑ کی مانند اپنے گناہوں کے سبب سے محسوس کرتا تھا اور وہ بوجھ جو پہلے پہاڑ کی مانند اس کی جان پر سخت گراں تھا خداوند کریم کی رحمت کے دریایِ بے پایان میں پھینک دیا جاتا ہے (متی ۲: ۲۱، مرقس ۱۱: ۲۳)۔ اس کی اندرونی تاریکی خارج ہوجاتی ہے اور آسمانی نور اس کے دل کو منور کرنے لگتا ہے کیونکہ اس کے دل پر خدا کی محبت حکمران ہوجاتی ہے اور وہ سیدنا مسیح کے وسیلہ سے اللہ جل شانہ کو اپنا آسمانی باپ تسلیم کرتا ہے۔ اس حالت میں گنہگار اپنے گناہوں سے دست بردار ہوجاتا ہے اوراس کی کوشش میں مشغول ہوتا ہے کہ خدا سے فضل پا کر احکام الہیٰ کی محافظت ومتابعت کرے۔پس وہ خدا کی رفاقت کے وسیلہ سے اسی دنیا میں اذیتوں اور رنج وغم کے درمیان بھی بے بیان خوشی

---

[1] یوحنا ۸: ۳۴تا ۳۶

[2] رومیوں ۱۴: ۱۳۔ افسیوں ۵: ۱۱، کلسیوں ۱: ۱۳۔ تھسلنیکیوں ۵: ۴، ۵ ۱ پطرس ۲: ۹،

واطمینان سے معمور رہتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی تجربہ سے جانتا ہے کہ نجات کے پھلوں کے بارے میں جو کچھ بائبل کہتی ہے وہ سب سچ ہے۔

پس مسیح کے ایماندار کا دل روح القدس کے وسیلہ سے ایسا تبدیل ہوجاتا ہے کہ وہ نہ فقط گناہ سے ہٹ کر نیکوکاری اور تاریکی سے نکل کر نور اور شیطان سے پھر کر خدا کی طرف مائل ہوجاتاہے بلکہ فی الحقیقت نئی روحانی پیدائش وقوع میں آتی ہے۔ (یوحنا ۳: ۳، ۵) جس کے سبب سے مسیح کا سچا ایماندار روحانی طور پر بالکل ایک نیا مخلوق بن جاتاہے(۲ کرنتھیوں ۵: ۱۷، دیکھو گلتیوں ۶: ۱۵)۔

خداوند کریم چاہتا ہے کہ ہر ایک انسان اپنے گناہوں سے توبہ کرے اور سیدنا مسیح پر ایمان لا کر نجات حاصل کرے (حزقی ایل ۳۳: ۱۱، ۱ تمتھیس ۲: ۳تا ۶، ۲ پطرس ۳: ۵)۔ لہذا کسی کے سامنے نجات کی امید کا دروازہ بند نہیں ہے۔ جو کوئی سچے دل اور خلوصِ نیت کے ساتھ سیدنا مسیح کے وسیلہ سے گناہوں کی معافی چاہتاہے ضرور اسے حاصل کریگا(یوحنا ۶: ۳۷)۔ لیکن جو اپنے نیک اعمال پر بھروسہ کرتے ہیں اور شیطانی وسوسہ کے مطابق سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے لئے بہت سا ثواب جمع کر رکھا ہے اوراس بنا پر نجات کے لئے مسیح کے پاس نہیں آتے وہ روح القدس کا مقابلہ کرتے ہیں اوراپنے اوپر آپ ہی سزا وعذاب لارہے ہیں (یوحنا ۳: ۱۶تا ۲۱۔ ۵: ۴۰)۔ اگرچہ اب وہ سیدنا مسیح کی محبت ورحمت کا مقابلہ کرتے رہیں لیکن آخر کار جیسا کہ کُتب مقدسہ میں مرقوم ہے کہ ان کو اس کے حضور میں سرنگوں ہونا ہی پڑیگا (یسعیاہ ۴۵: ۳۳، رومیوں ۱۴: ۱۱، فلپیوں ۳: ۹تا ۱۱)۔

اس مندرجہ بالا بیان سے صاف عیاں ہے کہ جب سیدنا مسیح پر ایمان لانے سے دل تبدیل ہوجاتا ہے تو انسان بے پرواہ یا گناہ میں مبتلا نہیں رہ سکتا۔ یہ زندہ اور زندگی بخش ایمان ہے جو بنی آدم کو ہر طرح کی نیکی کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور بدی سے روکتا ہے۔ پس مسیح کا ایماندار بشرطیکہ اس کا ایمان حقیقی ایمان ہو روح القدس کے فضل کے وسیلہ سے اپنے دل میں گناہ کو مغلوب کرلیتا ہے اور دنیا کی آزمائشوں اور جسم وشیطان کا مقابلہ کرتا ہے۔ اپنی بُری خواہشوں کو پایمال کرکے خدا کی مرضی کے موافق نیکی وپاکیزگی کی زندگی بسر کرنے میں ہمہ تن مصروف ہوجاتاہے۔ چونکہ سیدنا مسیح کے وسیلہ سے خدا کی لاانتہا محبت ورحمت کا مزہ چکھ لیاہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ اس کے ایمان سے اسے کیسی فرحت وراحت نصیب ہوتی ہے اس لئے وہ ہر ایک گناہ آلودہ خیال اور کام سے پرہیز کرتا ہے اور شب وروز کوشش کرتا ہے کہ احکام الہیٰ کو بجالائے اور نور میں چلے جیسا کہ نور کے فرزندوں کوواجب وزیبا ہے۔

چھٹا باب

سچے مسیحی کی زندگی اور اس کا چال چلن

انجیل شریف میں مذکور ہے کہ ایک دن ایک یہودی شریعت دان نے سیدنا مسیح سے پوچھا کہ توریت میں سب سے بڑا حکم کونسا ہے۔ مسیح نے جواب دیا کہ خداوند[1] اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے اور دوسرا اس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی[2] سے اپنے برابر محبت رکھ۔ انہی دو حکموں پر تمام تور اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے ۔(متی ۲۲: ۳۵تا ۴۰۔ مرقس ۱۲: ۲۸تا ۳۱)۔ اسی کے مطابق عہدِجدید میں ایک اور مقام پر یوں مرقوم ہے " آپس کی محبت کے سوا کسی چیز میں کسی کے قرضدار نہ ہو کیونکہ جو دوسرے سے محبت رکھتا ہے اس نے شریعت پر پورا عمل کیا ہے۔ کیونکہ یہ باتیں کہ زنا نہ کر، خون نہ کر، چوری نہ کر، لالچ نہ کر اور ان کے سوا اور جو کوئی حکم ہو ان سب کا خلاصہ اس بات میں پایا جاتا ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنی مانند محبت رکھ۔ محبت اپنے پڑوسی سے بدی نہیں کرتی۔ اس واسطے محبت شریعت کی تعمیل ہے"(رومیوں ۱۳: ۸تا ۱۰)۔ خدا سے محبت رکھنا اس کی مخلوقات سے محبت پیدا کرتاہے اور خصوصاً تمام بنی آدم سے ۔ حقیقی مسیحی خدا سے محبت رکھتاہے کیونکہ وہ جانتاہے کہ خدا نے پہلے اس سے محبت رکھی ہے (۱ یوحنا ۴: ۹، ۱۱، ۱۹ ورومیوں ۵: ۵تا ۸)۔ اوراس الہیٰ محبت کے وسیلہ سے وہ اس چند روزہ دنیا کی لذتوں اور دولت کے خیال سے دست بردار ہوجاتاہے اور (۱ یوحنا ۲: ۱۵تا ۱۷)۔ جس قدر یہ محبت اس کے دل میں بڑھتی جاتی ہے اسی قدر وہ خدا کی خدمت اوراپنے ابنایِ جنس کے ساتھ نیکی کرنے میں ترقی کرتا چلاجاتاہے۔ وہ محسوس کرتاہے کہ خدا اس کا آسمانی باپ ہے اور وہ سیدنا مسیح کے وسیلہ سے خدا کا فرزند ہے(یوحنا ۱: ۱۲، ۔ ۱ یوحنا۳: ۱، ۲)۔ لہذا وہ خدا پر توکل کرتاہے اوراپنے خیالات اور اقوال وافعال کے وسیلہ سے خدا کی عزت وجلال کے اظہار میں ساعی و کوشاں رہتاہے(زبور ۶۳: ۱تا ۸)۔ جب کبھی شیطان اس کے سامنے کوئی آزمائش پیش کرتاہے تووہ حضرت یوسف کی طرح یوں کہتا ہے " میں ایسی بڑی بدذاتی کیوں کروں اور خدا کا گنہگار ٹھہروں"؟ (پیدائش ۳۹: ۹)۔ اور جوکچھ وہ کرتاہے انسان کو خوش کرنے کے لئے نہیں بلکہ خدا کی خوشنودی اورجلال کے لئے کرتا ہے(کلسیوں ۳: ۲۳) جوں جوں وہ خدا کے عرفان اوراسکی محبت میں ترقی کرتا جاتاہے ان تمام جسمانی وروحانی نعمتوں اور برکتوں کے لئے جو خدا اسے عنایت فرماتاہے ہمیشہ شکر گزاری اور حمدوثنا کرتاہے اور فقط الفاظ ہی سے شکر گزاری کا اظہار نہیں کرتا بلکہ اپنی عملی زندگی کے تمام اقوال وافعال سے شکر گزار ہوتا ہے۔(زبور ۳۴: ۱ کلسیوں ۳: ۱۷، ۱ تھسلنیکیوں ۵: ۱۵تا ۲۲)۔

سچے مسیحی کا ایک اور خاصہ یہ ہے کہ اپنے دینوی معاملات میں جب کبھی وہ کسی دکھ تکلیف یا مصیبت میں مبتلارہتاہے توانسان پر بھروسا نہیں کرتا بلکہ اس کا توکل خدا پر ہوتاہے۔وہ بہت دولتمند اور عالی رتبہ بننے کی جستجو میں نہیں رہتا اوراس کو اپنی روزی ومعاش کی حد سے زیادہ نامناسب فکر نہیں ہوتی

---

[1] دیکھواستثنا ٦: ۵

[2] دیکھواحبار ۱۹: ۱۸

بلکہ وہ خدا سے دعا کرتا ہے کہ اس کے کاروبار میں برکت بخشے تا کہ وہ کسب حلال کے وسیلہ سے اپنی تمام ضروریات کو رفع کرسکے۔ اسے اپنے دل میں کامل یقین ہوتا ہے کہ اس کے آسمانی باپ کو اس کی فکر ہے (۱ پطرس ۵: ۷) اور اس لئے وہ اپنی تمام فکریں خدا پر ڈال سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ خدا نے اس کے لئے سیدنا مسیح کے وسیلہ سے اپنے روحانی برکتوں کے خزانہ کا دروازہ کھول دیا ہے اور اس لئے اسے کامل یقین ہے کہ خداوند کریم اس کی جسمانی ضروریات کو بھی ضرور رفع کریگا (زبور ۲۸: ۷، متی ۶: ۹، ۳۴۔ ۱ تمتھیس ۶: ۶ تا ۱۱)۔

مسیحی آدمی آرام وراحت اوراقبال مندی کے لئے خدا کا شکر گزار ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ہر ایک اچھی بخشش اور ہر ایک کامل انعام اسی سے آتا ہے ۔(یعقوب ۱: ۱۷)۔ لیکن دکھ درد اور رنج وغم اور مصیبتوں میں وہ صبر کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ سب چیزیں مل کر خدا سے محبت رکھنے والوں کے لئے بھلائی پیدا کرتی ہیں (رومیوں ۸: ۲۸)۔ وہ گویا قدیم زمانہ کے ایک نیک مرد کے اس قول کو سنتا ہے " مسیح کی تمام زندگی دکھ اور مصیبت کی زندگی تھی اور کیا تو اپنے لئے آرام وراحت چاہتا ہے "؟ وہ خوب جانتا ہے کہ اس کی تکالیف سے آسمانی باپ کا مقصد یہ ہے کہ اسے اپنی قربت میں کھینچ لے۔ اس لئے وہ رنج وغم میں بھی شادمانی کرسکتا ہے (رومیوں ۳: ۴، ۵، ۱۲: ۱۲)۔ اور یوں کہہ سکتا ہے " یہ خداوند ہے۔ جو بھلا جانے سو کرے" (۱ سیموئیل ۳: ۱۸)۔ وہ یاد رکھتا ہے کہ اگرچہ وہ دنیا میں رہتا ہے تو بھی دنیا کا نہیں کیونکہ حضرت ابراہیم کی طرح وہ اس پایدار شہر کا امیدوار ہے جس کا معمار اور بنانے والا خدا ہے (عبرانیوں ۱۱: ۱۰، دیکھو زبور ۳۷: ۵، ۲ کرنتھیوں ۴: ۱۷، ۱۸۔ عبرانیوں ۱۲: ۵، ۶)۔

سچا مسیحی روح وراستی سے خدا کی عبادت وپرستش کرتا ہے (یوحنا ۴: ۲۴)۔ وہ ہمیشہ خدا کی حضوری کو محسوس کرنا چاہتا ہے۔ وہ ہر وقت اس طرح سے خدا کی طرف رجوع لاتا ہے جس طرح بیٹا اپنے پرُاز محبت باپ کی طرف کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدا کو اس کی فکر ہے۔ جب بیٹا اپنے باپ سے کچھ مانگتا ہے تو اس کا مانگنا بالکل بے ساختہ اور بناوٹ سے خالی ہوتا ہے۔ وہ کوئی خاص الفاظ استعمال نہیں کرتا۔ اسی طرح سے مسیحی کو بھی کوئی خاص مروج الفاظ یا کوئی خاص مقدس زبان استعمال کرنا ضروری نہیں ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدا دینے کے لئے انسان کے مانگنے سے ہمیشہ زیادہ مستعد ہے اور اس کی بخششیں انسان کی آرزو اور اس کے حق سے بہت بڑھ کر ہیں۔ خدا ہمارے مانگنے سے پیشتر ہماری ضروریات کو جانتا ہے اور ہم تو مطلق نہیں جانتے کہ ہمارے لئے کیا بہتر ہے۔ لہذا سچا مسیحی تمام دینوی ضروریات کے لئے عرض کرنے سے پیشتر یوں کہتا ہے " اے خدا اگر تیری مرضی ہو" ۔ لیکن آسمانی چیزوں اور روحانی برکتوں (یوحنا ۱۴: ۶، ۱ تیمتھیس ۲: ۵)۔ عہدِ جدید بُت پرستی کی سخت مذمت بیان کرتا ہے (۱ کرنتھیوں ۵: ۱۰، ۱۱، ۶: ۹، ۱۰: ۷، ۱۴، گلتیوں ۵: ۲۰ افسیوں ۵: ۵ وکلسیوں ۳: ۵ ۱ پطرس ۴: ۳ مکاشفہ ۹: ۲۰، ۲۱: ۸، ۲۲: ۱۵) اور عہدِ عتیق کی تواریخ اس امر کے بیان سے بھری پڑی ہے کہ خدا نے بار بار اسی گناہ کے سبب سے بنی اسرائیل کو نہایت سخت سزادی۔ چونکہ اس قسم کے اعمال تمام بائبل میں ممنوع ومذموم ہیں لہذا یہ کہنا سچ نہیں کہ مسیحی لوگ بُت پرست ہیں جیسا کہ مسلمانوں کو بُت پرست نہیں کہہ سکتے اگرچہ ان میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جو قرآن کی تعلیم کے خلاف اولیا ودیگر مردہ لوگوں کی پرستش کرتے ہیں اور بعض تو

درختوں اور پتھروں کے سامنے بھی جھکتے ہیں مثلاً کعبہ کے سنگِ اسود کی تعظیم وتکریم کرتے ہیں۔

سچا مسیحی وہ ہے جو مسیح کی پیروی کرتا ہے اوراپنی عملی زندگی اور اپنے چال چلن کے وسیلہ سے اس کا سچا گواہ ہے۔ ظاہری کلیسیا کے باب میں سیدنا مسیح نے خود فرمایا ہے کہ گیہوں میں کڑوے دانے بھی اگینگے (متی ۱۳: ۲۴، ۳۰، ۳۶، ۴۳)۔ لیکن کوئی صاحب وفہم ذی ہوش آدمی کاٹنے کو انگور اور بد کو نیک تصور نہیں کرسکتا۔ سرہ رائج الوقت سکہ کے قبول کئے جانے کے خلاف جعلی سکوں کا وجود دانا تاجر کے نزدیک کوئی دلیل نہیں۔

ساتواں باب

عہدِ عتیق وجدید کو حقیقی اور سچا الہام الہیٰ تسلیم کرنے کے لئے خاص دلائل کا خلاصہ

تمہید میں بیان ہوچکا ہے کہ چند ایسے معیار ومحکِ امتحان ہیں جن سے ہمیں ان کتب کو جانچنا چاہیے جو حقیقی الہام الہیٰ ہونیکی دعویدار ہیں۔ معزز پڑھنے والے نے اس سے پیشتر کے ابواب کے مطالعہ سے معلوم کرلیا ہوگا کہ ان معیاروں سے بائبل کی تائید وتصدیق ہوتی ہے لیکن ہم اس امر کو اور بھی صاف وروشن کرنا چاہتے ہیں اوران دلائل کا خلاصہ پیش کرینگے جن سے یہ حقیقت ایسے کامل طور سے ثابت ہوتی ہے کہ شک وشبہ کا امکان تک باقی نہیں رہتا۔

۱۔ سب سے پہلے انجیل شریف سیدنا مسیح کو عملی زندگی اور چال چلن کے لحاظ سے ہمارے سامنے اس کامل اور پاک انسان کی صورت میں پیش کرتی ہے جو کبھی اس زمین پر سکونت پذیر ہوا۔ بہت سی اقوام نے اپنی کتبِ علمِ ادب میں کامل انسان کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ بعض حالتوں میں تو یہ بیانات محض بے بنیاد افسانوں کی مانند ہیں جیسا کہ کتبِ ہنود میں رام اور کرشن کا احوال ہے اور بعض حالتوں میں بے شک قصہ وحکایت کے لئے تواریخی بنیاد تو موجود ہے لیکن شخصِ زیر بحث کے بارہ میں بہت سی مبالغہ آمیز روایات پیدا ہوگئی ہیں۔ مثلاً بدھ کا حال ایسا ہی ہے۔ لیکن جب ہم سیدنا مسیح کے ساتھ تمام دیگر بڑے بڑے آدمیوں کا مقابلہ کرتے ہیں جو کبھی اس زمین پر پیدا ہوئے یا افسانوں میں ان کا ذکر پایا گیا تو ان میں سے کوئی بھی حلم ونیکی ،

مہربانی ومحبت ورحمت اور پاکیزگی وبے گناہی وعدل یا کسی اور نیک صفت میں اس کی برابری کا دعویٰ نہیں کرتا۔ چونکہ اس کا چال چلن شاعروں اور افسانہ نویسوں کے خیالی وفرضی ممدوحوں پر بھی فائق ہے لہذا وہ وہم تصور کی ایجاد نہیں بلکہ حق وحقیقی ہے۔ جو کتاب اس کو ہم پر ظاہر کرتی ہے۔ وہ یقیناً من جانب اللہ ہے یعنی جو لوگ اسے جانتے تھے اور جنہوں نے اس کے بارے میں اپنے علم ومعلومات کو قلمبند کیا ان کو اس کے وعدے کے مطابق (یوحنا ۱۶ : ۱۲ ، ۱۳)۔ خدا کی طرف سے ہدایت وتوفیق عنائت ہوئی کہ اس کے حق میں اپنی تحریروتقریر میں سچی گواہی دیویں (اعمال الرسل ۱ : ۸)۔ سیدنا مسیح اپنا ثبوت آپ ہے۔ چنانچہ مثنوی میں مرقوم ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب   گردلیلت باید ازوی رومتاب

۲۔ کوئی کتاب خدا کا کامل مکاشفہ نہیں ہوسکتی بلکہ کوئی شخص ہونا چاہیے۔ لیکن جو کتاب اس شخص کے حق میں شہادت دیتی ہے اوراس کو ڈھونڈنے اور پانے میں ہماری رہبر ہوتی ہے وہ ہرگز ہرگز اس کام کو سرانجام نہیں دے سکتی جب تک کہ الہٰی ہدایت سے نہ لکھی گئی ہو۔ جو لوگ دعا ومناجات کے ساتھ بائبل کو مطالعہ کرتے ہیں اور فی الحقیقت دلی آرزو کے ساتھ حق کی تلاش میں ہیں ان کو صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ مسیح جس کا عہدِ عتیق میں وعدہ کیا گیا اور عہدِ جدید میں عطا ہوا وہی تمام بائبل کا مطلب ومقصد ہے۔ بائبل اسی کو نجات دہندہ کلمتہ اللہ بتاتی ہے اوراس لئے اسی کو ایسا شخص بیان کرتی ہے جو فی الحقیقت خدا کو انسان پرظاہر کرسکتا ہے۔ ہم کو اس کا بیان سنا کے اوراس کے چال چلن اوراس کی عملی زندگی وموت وقیامت اور تعلیم اور وعدوں کو پیش کرکے اوراس کے بے نظیر اظہارِ الہٰی کے وسیلہ سے انجیل شریف نے اس مشکل کو حل کردیا جس کا حل کرنا پیش ازین کبھی کسی کے امکان میں بھی نہ تھا یعنی یہ کہ خدایِ واحد وبرحق جہان کا خالق کیونکر بنا اور پھر اس نے اپنے آپ کو اپنی مخلوقات پر کس طرح سے ظاہر کیا ؟ قدیم زمانہ کے حکیم اس کا کوئی معقول جواب نہ دے سکے اورایسے ہی وہ یہودی بھی جنہوں نے سیدنا مسیح کو رد کیا تاہم اسی طرح مسلمان علمایِ دین کو بھی کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی چنانچہ القرآن[1] الموارین کا مصنف یوں لکھتاہے " ہومدر کے راآلت اور باید۔ باشد کہ میان مدرک ومدرک ازجود مناسبتے ناچار خدارا ازجہت ذات بامخلوقات نسبتِ ارتباط ومقار ---مشابہت نتوانند بوپس ذات الہٰی رااحدے از مخلوقات --- ادراک واحاطہ کند " (صفحہ ۱۲)۔ ہیچ یک از افعال وصنائع کہ دلیل وجود صافع وفاعل ہستند نہ خود شان ذات صانع را توانند ادراک نمود ونہ دیگر برابر مقام ذات اوادراک حقیقت او توانند رسانید"(صفحہ ۱۷)۔ لہذا یہ مصنف ہم کو بتاتاہے کہ ایک مخلوق نخستین ہے جو فی الحقیقت خدا کا مخلوق واحد ہے اوراس کے سوا اور کوئی مخلوق نہیں۔ چنانچہ مرقوم ہے " جمال مطلق ازل است ونور کلی حضرت لم یزل (صفحہ ۲۷)۔ جب خدا نے اپنی مخلوقات کو خلق کرنا چاہا توپہلے اس نے مخلوقِ نخستین کو پیدا کیا اور وہ مخلوق نخستین خدا کی تمام محبت کا مورد اور صفاتِ ربانی کا مظہر بن گیا۔ خدا کا محبوب ہو کر وہ خدا سے محبت رکھنے لگا۔ وہی مخلوقِ نخستین جو ابتدا میں ازلی منبع سے پیدا ہوا فاضلترین درمیانی اور بزرگترین دنبی مطلق ایزدی ہے اور کائنات میں ابتدا سے انتہا تک جو کچھ وقوع میں آتا ہے سب اسی کے[2] وسیلہ سے ہے۔ لیکن یہ

[1] طبع چہارم مطبوعہ امپیریل پریس قسطنطنیہ ۱۲۸۸ ہجری۔

[2] صفحہ ۲۹

عقیدہ اسلامی الاصل نہیں ہے بلکہ یہ ملحد وبے دین حکما[1] سے حاصل ہوا ہے۔ مثلاً اریس ملحد نے یہ تعلیم دی کہ ایک مخلوقِ نخستین موجود تھا اور جہان کو پیدا کرنے میں خدا نے اس کو وسیلہ بنایا۔ مانی بھی آدم اول کے بارے میں بہت کچھ ایسا ہی عقیدہ رکھتا تھا اگرچہ اس نے کہا کہ بعد میں شیطان نے اسی پہلے آدم کی مانند ایک آدمی بنایا اور اس میں صاف ترین نور اور اپنی تاریکی کو جمع کیا جیسا کہ عالم الصغیر میں۔ علاوہ بریں النخشیۃ یعنی سانپ کی پرستش کرنے والے ملحد فرقہ کے لوگ جو اپنے آپ کو عرفا کہتے تھے ایک مخنث کی تعظیم وتکریم کرتے تھے اور اس کو غیر المغلوب کہتے تھے۔ وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اس کو جاننا عرفانِ الہیٰ کا آغاز ہے۔ ان کے اقوال میں سے ایک یہ تھا" کمال کا شروع عرفان انسانی اور اس کی تکمیل عرفان الہیٰ ہے" آدم اسی آسمانی اصل آدمی کا نمونہ تھا جو بزرگ وبہترین اور کامل آدمی کہلاتا تھا۔ یہودیوں کی ایک کتاب القبالا جو زیادہ تر غیر اقوام سے اخذ کردہ لغویات سے پُر ہے اس میں کسی قدر علمایِ اسلام کے خیالات کا نمونہ موجود ہے ۔ اس میں مرقوم ہے کہ خدا ازل ہی سے اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس خواہش کو عملی صورت میں لانے کے لئے اس سے پہلا سفیراہ یعنی خروج صادر ہوا اور پھر دوسرے سے تیسرا اور اسی طرح سے دس تک نوبت پہنچی ۔ یہ سب مل کر اصلی آدمی بنتا ہے جس کو قبالوی **דדםרםוא** آذام قذمون یعنی آسمانی آدمی کہتے ہیں ۔ اس کا سر پہلے تین صدور سے مرکب تھا۔ زمینی آدم اسی کی ایک دھندلی تصویر ہے۔

[1] کچھ ایسا ہی عقیدہ فیلو نے بیان کیا ہے چنانچہ ملک الموت اور کلمہ ازلی کے باب میں کہتا ہے کہ حدود پر کھڑے ہو کر مخلوق کو خالق سے جدا کرتے ہیں دیکھو فیلو کا رسالہ مسمی بہ اس کی بابت جو وارث ہے۔

لیکن مخلوقِ نخستین فرض کرنے سے بھی مشکل حل نہیں ہوتی خواہ ہم اس کا کچھ ہی نام رکھیں۔ جیسا کہ میزان الموازین کا مصنف لکھتا ہے کہ کوئی مخلوق خالق کے ادراک واظہار پر قادر نہیں ہم اس صاف منطقی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ موہوم مخلوق نخستین چونکہ خود مخلوق ہے اس لئے اس میں بھی ادراک واظہار الہیٰ قدرت نہیں۔ اگرچہ وہ انسان سے کتنا ہی اعلیٰ وبالا ہو تو بھی اس کے اور اس کے خالق کے درمیان ایک ناممکن العبور خلیج واقع ہے۔ پس اگر ہم اس فلسفہ وحکمت کو قبول کریں تو ہم کو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ انسان خدا کو کبھی نہیں جان سکتا اور اس سے دین ومذہب کی بالکل بیخکنی ہوجائیگی۔ مخلوقِ نخستین کی عبادت کرنا مخلوق کے تخت پر بٹھانا ہوگا۔ یہ شرک سے بھی بد تر ہے جس کو قرآن[2] ناقابل معافی گناہ بیان کرتا ہے ۔ لہذا مخلوقِ نخستین کو فرض کرنے سے ہمیں کچھ فائدہ نہیں۔

اس بیکسی کی حالت میں انجیل شریف ہماری مدد کو آتی ہے اور ہم پر اس کلمۃ اللہ کے وجود کو ظاہر کرتی ہے جس کو حکمای سلف کبھی اپنے وہم وتصور میں بھی نہ لاسکے تھے۔ جو خدا باپ کے ساتھ واحد ذات رکھتا ہے (یوحنا ۱۰ : ۳۰) اور پھر بھی اپنے تجسم کے وسیلہ سے بنی آدم کی انسانیت میں شریک ہے۔ جو کتاب خدا کے اس واحد کشف واظہار کو منکشف کرتی ہے ضرور ہے کہ اس کی تعلیم کا منبع ومصدر خود خدا ہو۔ بائبل کی تعلیم اور اسلام کی مندرجہ بالا فیلسوفی میں جو فرق ہے وہ قابل غور ہے۔ دونوں میں ایک متواسط یعنی خدا وانسان میں درمیانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔ لیکن فلسفہ وحکمت کا عقیدہ

[2] سورہ نساء آیات ۵۱، ۱۱٦

مثلاً وہ جس کی میزان الموازین میں تعلیم دی گئی ہے ایک ایسے موہوم وجود کا ذکر کرتاہے جو نہ خدا ہے نہ انسان۔ جس کی مفروضہ ہستی کا دار ومدار یہودیوں اور بُت پرستوں اور ملحدوں کے قیاسات پر ہے جن کو بعض مسلمانوں نے بھی مان لیا ہے۔ مسیحی عقیدہ کی بنیاد اس الہام پر ہے جو خدا نے ہم کو عنایت فرمایا ہے۔ اس الہام سے ہم کو ایک حقیقی درمیانی سیدنا مسیح کی خبر دی گئی ہے جو کامل خدا اور کامل انسان ہے۔ جس نے اپنی پاک زندگی اور چال چلن سے اوراپنے مبارک کلام کی تعلیمات سے خدا کو ہم پر ظاہر فرمادیا ہے اور جس نے خود صلیب پر جان دے کر ہمارے گناہوں کا کفارہ دیا ہے۔ اگر ہم کو ان دونوں عقیدوں کے بارے میں فیصلہ کرنا ہو تو یہ کہنا کچھ مشکل نہیں کو کہ نسا معقول اور قابلِ قبول ہے۔ کونسا بنی آدم کی بناوٹ ہے اور کونسا خدا کی طرف سے انبیاء ورسل کے وسیلہ سے کتب مقدسہ میں مکشوف ہوا۔

۳۔ انجیل شریف صریحاً من جانب اللہ ہے کیونکہ اس کے وسیلہ سے انسانی روح کی آرزو میں جو عرفان خدا۔ خدا کے حضور میں۔ راستبازی ، گناہوں کی معافی اور دل وزندگی کی پاکیزگی کے لئے ہیں سب پوری ہوجاتی ہیں ۔(۱)انجیل بنی آدم کے حق میں خدا کا ازلی ارادہ بتاتی ہے اور یہ ظاہر کرتی ہے کہ انسان کس لئے پیدا کیا گیا۔ کس قدر گناہ میں خلق ہوگیا ہے اور پاکیزگی کا کیسا محتاج ہے۔ (۲) انجیل سے عیاں ہوتا ہے کہ کس طرح ہم سیدنا مسیح پر ایمان لانے کے وسیلہ سے گناہوں کی معافی حاصل کرنے سے خدای عزوجل کی نظر میں راستباز ٹھہر سکتے ہیں۔ (۳)انجیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح سے سیدنا مسیح پر ایمان لانے سے ہمارے دل پاک ہوجاتے ہیں اور روح القدس ان کو ہیکل بنا کر ہمارے خیالات وخواہشات کو پاک کرتا ہے ۔ جس قدر ہم خدا سے محبت رکھنے میں ترقی کرتے جاتے ہیں اسی قدر ہم کو گناہ وشیطان کا مقابلہ کرنے کی زیادہ طاقت ملتی ہے ۔(۴) انجیل ہی سے ہم پر یہ امر منکشف ہوتا ہے کہ کیونکر ہم سیدنا مسیح کے وسیلہ سے خدا کے فرزند بن سکتے ہیں۔ تب ہم روحانی خوشی اور سلامتی سے معمور ہو کر کامل امید ومحبت کے یقین کے ساتھ روزِ قیامت وابدی سعادت اور خدا کے حضور کی پاکیزگی کے منتظر ہوسکتے ہیں۔ چونکہ انجیل شریف کے وسیلہ سے انسان کی روحانی حاجات اس طرح سے رفع ہوجاتی ہیں اس لئے انجیل ضرور انسان کے لئے اللہ جل شانہ کا پیغام ہے۔

تجربہ سے یہ بات ظاہر ہے کہ دیگر ادیان ومذاہب کی کتابوں سے ایسا نہیں ہوسکتا۔ان میں سے کونسی دل اور زندگی کی پاکیزگی طلب کرتی ہے ؟ ان میں سے کونسی ایسے فردوس کا ذکر کرتی ہے جس میں کوئی ناپاک چیز داخل نہیں ہوسکتی اور جس میں نجات یافتہ لوگ ہر طرح کی بدی اور ہر ایک ایسی بات سے خالی ہیں جو حق سبحانہ وتعالیٰ کی مرضی وذات کے خلاف ہے؟ ان کتابوں سے یہ بات مطلق ظاہر نہیں ہوتی کہ گناہ سے نجات اور خدا کی درگاہ میں مقبولیت کیونکر حاصل کرسکتے ہیں۔ پس ان سے انسان کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ وہ حج کرنے اور روزہ رکھنے اور قربانیاں گذراننے کی تعلیم دے سکتی ہیں ۔ لیکن چونکہ ان افعال واعمال سے نہ دل پاک ہوتا ہے اور نہ اللہ جل شانہ کا عرفان حاصل ہوتا ہے لہذا ان کو عمل میں لانے والے بدستورِ سابق آسمانی باپ کے گھر سے دور بھٹکتے پھرتے ہیں۔

۴۔ دل اور زندگی کی وہ تبدیلی جو انجیل شریف کی فرمانبرداری سے سچے مسیحی میں ہوتی ہے اس کے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت ہے۔ یہ تبدیلی پہلے باطن میں ہوتی ہے اور پھر ظاہر میں اس کا اظہار ہوتا ہے اور یہ اتنی بڑی

تبدیلی ہے کہ اس کے لئے نئی اور روحانی پیدائش (یوحنا ۳: ۳، ۵) کا نام جو روح القدس کی مدد سے وقوع میں آتی ہے نہایت موزون وزیبا ہے۔

۵۔ ذاتِ باری تعالیٰ کی اخلاقی صفات یعنی پاکیزگی ومحبت ورحمت وعدل کے متعلق نہایت صفائی سے تعلیم دی گئی ہے اور نیز ان صفات کے بارے میں جن سے وہ وحدہ لاشریک وقادرِ مطلق اور عالم الغیب اور تمام جہان کا خالق ومحافظ ثابت ہوتا ہے۔ کتب مقدسہ میں ہم کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے آپ کو سیدنا مسیح میں ظاہر فرمایا جو نیکی کرتا پھرا۔ جس نے کبھی کسی کو جو معافی اور مدد کے لئے اس کے حضور میں آیا نکال نہ دیا۔ جو بے گناہ تھا لیکن گنہگاروں پر مہربان ورحیم تھا۔ جس نے ریاکاری کی مذمت کی اور غیر تائب گنہگاروں کے لئے عذاب الہیٰ کو یقینی بیان فرمایا اگرچہ اس نے ہم کو گناہ اور گناہ کے نتائج سے بچانے کے لئے اپنی جان دیدی۔ پس بائبل نہ فقط ہم کو خدا کے بارے میں بتاتی ہے بلکہ اس کو ایسے طور سے ہم پر ظاہر کرتی ہے کہ ہر ایک فرد بشر اس کو دیکھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ دیکھنا چاہے۔ ساتھ ہی بائبل ہم کو یہ تعلیم بھی دیتی ہے کہ خدا کی نظر میں گناہ ہمیشہ سخت نفرت کی چیز ہے اور پاکیزگی کے بغیر بنی آدم میں سے کسی کو بھی رویة اللہ نصیب نہ ہوگی (عبرانیوں ۱۲: ۱۴)۔

چونکہ اس زمانہ میں علماء کے لئے اقوام ماضی وحال کی کتبِ علوم وفنون سے واقفیت حاصل کرنا ممکن ہے۔ اس لئے ہم نے مطالعہ کے وسیلہ سے دریافت کیا ہے کہ علماء وحکمای سلف میں سے کسی نے بھی کبھی اللہ جل شانہ کو نہ مذکورہ بالا صفاتِ جلیلہ سے متصف نہیں کیا۔ دیگر ادیان ومذاہب کی کتابوں میں بھی یہ بات نہیں پائی جاتی۔ یہاں تک کہ جو کتابیں زیادہ تر عہدِ عتیق وجدید کی نقل ہیں ان میں بھی وہ ذاتِ پاک ان صفات سے متصف نہیں ہے۔ ایسی کتابیں توحیدِ الہیٰ کی تعلیم دیتے وقت بھی خدا کو بنی آدم پر ظاہر نہیں کرسکتیں بلکہ اس بعید الفہم ذوالجلال اوراس کی عاجز مخلوقات میں ایسی جدائی قائم کردیتی ہیں کہ بنی آدم کے لئے ہر گز ہر گز اپنے خالق کو جاننا ممکن نہیں۔

۶۔ انجیل شریف کا من جانب اللہ ہونا اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ اس کی تعلیم تمام دیگر کتب کی تعلیم سے اعلیٰ وپاک ہے۔ اس حقیقت سے انکار کی بارہا کوشش کی گئی ہے اور چینی وہندوستانی اور یونانی مصنفین کی عبارات پیش کرکے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ان میں بھی ایسی ہی اعلیٰ اخلاقی تعلیم مندرج ہے جیسی کہ انجیل میں ہے۔ لیکن یہ سب کوششیں بیکار ثابت ہوئی ہیں۔ مثلاً سیدنا مسیح نے یہ سنہلا قاعدہ سکھایا کہ " جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں وہی تم بھی ان کے ساتھ کرو"(متی ۷: ۱۲)۔ بعض یونانی وہندوستانی[1] حکما کی تصانیف میں اس کی نفی کی صورت ملتی ہے کہ ہم اوروں سے ایسا سلوک نہ کریں جیسا کہ ہم نہیں چاہتے کہ کوئی ہم سے کرے لیکن اس میں اور سیدنا مسیح کے اثباتی حکم میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ چین کے مشور فیلسوف کنفوشیس[2] نے کئی بار یہ حکم نفی کی صورت میں پیش کیا ہے لیکن اثباتی صورت میں ایک بار بھی نہیں لکھا۔ اس کا پوتا کنگ چہ زیادہ بہتر صورت پیش کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے " اعلیٰ درجہ کے انسان[3] کی راہ میں چار

---

[1] See instances in The Eightfold Path, pp.172, 173.

[2] Analects Bk.xii, ch.ii, Bkxv, cb,xxiii.Great Learning, Chx40

[3] Doctrine of the Mean, Ch.xiii 54.

چیزیں ہیں جن میں سے میں نے ابھی ایک بھی حاصل نہیں کی-----------۔ دوست کے ساتھ سلوک کرنے کا ایسا نمونہ پیش کرنا جیسا میں چاہوں کہ وہ میرے ساتھ سلوک کرے مجھ سے اب تک نہیں ہوسکا"۔ اس میں بھی کوئی اثباتی اصول موجود نہیں ہے۔ وہ فقط دوست کے ساتھ سلوک کرنے کا ذکر کرتاہے نہ کہ تمام بنی آدم کے ساتھ اوراس میں بھی وہ اپنی ناکامیابی کا معترف ہے۔ پھر اگر یہ ممکن ہوتا کہ تمام دنیا کے وہ اخلاقی اصول جمع کئے جاتےہیں جو عہد جدید یعنی انجیل کے اصول کی مانند ہوتے (یہ ایسا کام ہے جس کی لوگوں نے کئی بار کوشش کی ہے لیکن اس میں کبھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی) تو اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک چھوٹی سی کتاب میں جس کو ہم عہدِجدید کہتےہیں کہ کم از کم اس قدر اخلاقی تعلیم مندرج ہے جس قدر تمام دیگر کتب کے مجموعہ میں۔ اس ایک بات سے اس کا الہامی ہونا ثابت ہوسکتاہے کیونکہ عہدِ جدید کے لکھنے والے اپنے زمانہ میں محنت ومطالعہ سے خواہ کتنا ہی کام لیتے ہیں ان کے لئے چینی وہندوستانی ومصری ویونانی ولاطینی وفارسی اور دیگر مصنفین[1] کی تصانیف سے ان تمام اصول کو جمع کرنا کسی طرح سے ممکن نہ تھا۔ علاوہ بریں یہ تمام مجموعہ عہدِجدید کی اخلاقی تعلیم کی برابری نہ کرسکتا۔ یہ مرجھائے ہوئے پھولوں کا ڈھیر ہوتا درحالیکہ عہدِجدید تازہ پھولوں کا سرسبز باغ ہے جس میں جنگلی گھاس پھوس نام کو بھی نہیں۔ پھر سیدنا مسیح خود ہمارے لئے کامل نمونہ ہے جس نے اپنے اعلیٰ اخلاقی اصولِ زندگی پر خود عمل کیا۔ اس کا ثانی ونظیر کہیں نہیں ملتا۔ علاوہ بریں دیگر کتب میں اچھے

[1]ان میں سے بعض اس زمانہ میں پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

بُرے دونوں طرح کہیں نہیں ملتا۔ علاوہ بریں دیگر کتب میں اچھے بُرے دونوں طرح کے اصول وآئین موجود ہیں لیکن عہدِجدید میں فقط اچھے ہی پائے جاتےہیں۔ اس فرق کو ہم اور بھی اچھی طرح اس سے سمجھ سکتے ہیں کہ تسخیرِ خیبر کے بعد جو گوشت حضرت محمد اوران کے ساتھیوں کو کھانے کے لئے دیا گیا وہ تو اچھا تھا لیکن جو زہر[2] اس میں ملا تھا اس سے بشر اور دیگر کھانے والوں کو نقصان پہنچا۔ سب سے بڑھ کر انجیل سے توفیقِ اعمال یعنی مسیح کی محبت حاصل ہوتی ہے جس کا وجود اور کہیں نہیں ملتا۔ ایک دفعہ ایک طالب علم نے ایک بڑے گیانی بدھ مذہب کے سادھو سے پوچھا" آپ نے بائبل اوراپنی کتبِ دین دونوں کو پڑھا ہے۔ ان میں سب سے بڑا فرق کس بات میں ہے؟ سادھو نے جواب دیا" ہماری کتبِ دین اور بائبل دونوں میں بہت اچھے اچھے خیالات وجذبات موجودہیں لیکن ان میں سب سے بڑا فرق اس بات میں ہے کہ مسیحی لوگ جو کچھ کرنا مناسب ہے جانتے ہیں کہ اوراسے کرنے کی قدرت بھی رکھتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے لیکن جو کچھ ہماری نظر میں درست ومناسب ہے اس کو عمل میں لانے کی قدرت سے ہم خالی ہیں"۔ دوسرے دین گویا ریل کی سڑک بناتےہیں اور فقط مسیح ہی ایسا ہے جو انجن یا حرکت کی قوت عنایت کرتاہے جو گاڑیوں کو کھینچ کر منزلِ مقصود تک لے جاسکتی ہے۔ یہ فرق از بس قابلِ غور ہے۔ یہ بھی یادرہے کہ کنفوشیس نے اپنی تمام تصانیف میں فقط ایک مرتبہ خدا کا ذکر کیاہے اوروہ بھی اقتباس میں ہے۔ وہ کسی طرح کی دینی تعلیم نہیں دیتا۔

[2]ابنِ اثیر جلد دوم صفحہ ۸۴

۷۔ کتبِ مقدسہ کی مندرجہ پیشینگوئیوں کے پورا ہونے سے بھی ان کے الہامی ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ تمام جہان کی دیگر کتبِ دین میں اس حقیقت کی نظیر نہیں ملتی۔ جیسا کہ عہدِجدید سے ظاہر ہے کہ ان بے شمار پیشینگوئیوں کے علاوہ جو عہدِ عتیق میں مسیح کے حق میں موجود ہیں جن کو اس نے آکر پورا کیا ہمارے پاس خصوصاً جب اس نے سیریا[1] پر لشکر کشی کی تو وہ شہوت پرستی میں مشہور ہو گیا لیکن اسلام میں اس کو روکنے یا ناجائز قرار دینے کی کوئی بات نہ تھی بلکہ قرآن صاف طور سے کثیر الازدواجی اور لونڈیاں رکھنے کی تعلیم دیتا ہے اور حضرت محمد کے اپنے نمونہ سے اور مومنین اور خدا کی راہ میں لڑنے والوں کے لئے بہشت میں نفسانی خوشیوں کے وعدوں سے بھی اس کی ترغیب ملتی ہے جو ان میں سے میدانِ جنگ میں مارے جاتے تھے شہید کہلاتے تھے اور یہ ایمان رکھتے تھے کہ ایسوں کے صلہ وجزا میں حورانِ بہشت استقبال کو منتظر کھڑی رہتی ہیں خواہ وہ کسی لوٹ کے دھاوے میں مرے ہوں جس میں دوسرے لوگوں کا مال زبردستی چھیننا چاہتے تھے۔

جونہی حضرت محمد نے لڑائی اور لوٹ کی اجازت دی اہلِ عرب گردہا گروہ آپ کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔ مدینہ پہنچ کر چند ہی مہینوں میں جیسا کہ ابن ہشام بیان کرتا ہے" بنی اوس کے چند اشخاص کے سوا مدینہ میں کوئی گھر نہ تھا جو حضرت محمد پر ایمان نہ لایا ہو[2]"۔ مہاجرین اور انصار میں ایک عہد باندھا گیا اور ایک مسجد تعمیر کی گئی۔

---

[1] کاتب الواقدی فتوح الشام اس سے پیشتر بھی وہ اپنے طبعی میلان کا اظہار کرچکا تھا (دیکھو روضۃ الصفا جلد دوم صفحہ ۲۳۰)

[2] جلد اول صفحہ ۱۷۷

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہجرت سے پیشتر تیرہ سال کے عرصہ میں کیسے تھوڑے سے لوگ حضرت محمد پر ایمان لائے تھے لیکن برعکس اس کے اب اس قدر جلدی جلدی لوگ مسلمان ہونے لگے کہ ہجرت کے آٹھویں سال میں جب حضرت محمد نے مکہ پر لشکر کشی کی تو دس ہزار مسلمان آنحضرت کے ساتھ[3] تھے اور ۹ ھجری میں جنگِ تبوک کے وقت تیس ہزار تھے ۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد جب حضرت ابوبکر نے تسخیر سیریا کہ لئے فوج بھیجی توکاتبِ الواقدی کے بیان کے مطابق ایسی بے شمار تھی کہ ان لوگوں میں سے زیادہ تر اسلامی بہشت کی عیش وعشرت سے بھی بڑھ کر اس دنیا کے نفع کے خیال سے جوش میں آگئے تھے۔ ہم دیکھینگے کہ اور بہت سے لوگوں کی طرح خلیفہ المامون کی بھی یہی رائے تھی۔ لیکن ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جو مجبوراً اور اپنی جان بچانے کے لئے مسلمان ہونے کا اقرار کرتے تھے۔ مثلاً بہت سے یہودی جو مدینہ کے قریب وجوار میں رہتے تھے مسلمان ہوگئے لیکن ابن اسحاق[4] کہتاہے کہ "انہوں نے اسلام کی ظاہری صورت اختیار کرلی تھی اور انہوں نے قتل سے بچنے کے لئے بظاہر اسلام قبول کیا تھا" وہ ایسے بہت سے مسلمانوں[5] کے نام بھی بتاتا ہے۔ بنی النضیر و بنی قنقاع و بنی قریظہ وغیرہ ان کے بھائی بندوں کا جو انجام ہوا تھا اس کو دیکھ کر ان کے خوف زدہ ہوہنے کے معقول اسباب ثابت ہوتے ہیں۔

لیکن یہ فقط یہودی نہ تھے جن کو اسلام یا دردناک موت پسند کرنا حاصل کی ہے لیکن ان کی اشاعت کے وسائل اور ہی طرح کے ہیں۔ بعض حالتوں میں

---

[3] ابن اثیر جلد سوم صفحہ ۹۳

[4] فتوح الشام جلد اول صفحہ ۶ فنظر الیھم قد ملوا الارض رفتوح الشام مطبوعہ صفدری مطبع بمبئی ۱۲۹۸ ھجری۔

[5] سیرۃ الرسول جلد اول صفحہ ۱۸۳ فظھر وا با اسلام واتخدوہ جنۃ من الفتل

ان کی اشاعت کا باعث زیادہ تر دو باتیں ہیں یعنی تلوار اور اس دنیا میں جسمانی شہوات کو پورا کرنے کی اجازت اور ساتھ ہی قیامت کے بعد ان شہوات میں ابدآلاباد تک زیادہ غرق ہونے کی امید۔ لیکن کسی دین کا ایسے وسائل سے اشاعت حاصل کرنا اس کو اس رحیم ورحمان خدا کی طرف سے ثابت نہیں کرتا جو ظلم وستم وریاکاری وناپاکی سے سخت نفرت رکھتا ہے۔ قدیم زمانہ میں رومی سلطنت میں مسیحی دین کی اشاعت اس طرح سے نہیں ہوئی اور زمانہ حال میں بھی اقالیم عالم میں اس کی فتوحات کا حصول اس طرح سے نہیں ہے۔

اب جو کوئی کتبِ مقدسہ کے بارے میں مندرجہ بالا امور کا تمہید کے مذکورہ حقیقی الہام کے معیاروں سے مقابلہ کریگا وہ بآسانی تمام معلوم کرلیگا کہ یقیناً بائبل میں حقیقی الہام مندرج ہے۔ خاص کر اس لئے کہ اس میں آغاز سے انجام تک سیدنا مسیح کے حق میں شہادت پائی جاتی ہے۔ جو اکیلاہی کلمۃ اللہ اور مظہر ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔

آٹھواں باب

پہلی چند صدیوں میں مسیحی دین کی ترقی کس طرح سے ہوئی

جب سیدنا مسیح نے انجیل کی منادی کا کام شروع کیا تو اس نے اپنے شاگردوں میں سے بارہ آدمیوں کو منتخب کرلیا جن کو اس نے تمام دنیا میں عرفانِ حق کی اشاعت کے کام کے لئے تیار کیا۔ اس تیاری میں ان کو خدا کی مرضی اور راہِ نجات کے متعلق بھی نہایت احتیاط وتوجہ کے ساتھ تعلیم دی گئی ہے۔ لیکن جس طریقہ سے اس نے ان کو تعلیم دی وہ یہ تھا کہ ان کو اپنی پاک زندگی اور عجیب کاموں اور روحانی تعلیم کے گواہ بنایا تاکہ وہ اس کو اور اس کے وسیلہ سے خدا باپ کو جان سکیں (یوحنا ۱۴: ۶تا ۱۰-۱۷: ۳)۔ اس نے ان بارہ مردوں کو رسول کہا (لوقا ۶: ۱۳)۔ کیونکہ وہ انہیں اپنے پیغامبر[1] بنا کر بھیجنے کو تھا۔ اس کے جی اٹھنے کے بعد اور صعودِ مبارک سے تھوڑی دیر پیشتر اس نے انہیں تمام اقوام کو شاگرد بنانے (متی ۲۸: ۱۹)۔ اور " حدودِ عالم تک" اپنے آپ پر گواہی دینے کے لئے مقرر کرکے بھیجا (اعمال الرسل ۱: ۸)۔اس لئے کہ وہ تعلیم دینے میں غلطی نہ کریں اور اپنا کام بے خوف ہو کر وفاداری وکامیابی کے ساتھ کرسکی اس نے چند ہی روز میں ان پر رُوح القدس کے نازل ہونے کا وعدہ فرمایا (اعمال الرسل ۱: ۵، نیز دیکھو یوحنا ۱۴: ۱۶، ۱۷، ۲۶، ۱۵: ۲۶، ۱۶: ۷، ۱۵ اعمال الرسل ۱: ۴، ۸)۔ چنانچہ

[1] دیکھو سورہ صف آیت ۱۴۔

اس کے حکم کے مطابق (لوقا ۲۴: ۴۹ اعمال الرسل ۱: ۵)۔ وہ اس وعدہ نے پورا ہونے کا یروشلیم میں انتظار کرتے رہے۔ مسیح کے مصلوب ہونے سے پچاس روز اس کے صعود فرمانے سے سات روز بعد جبکہ نہ فقط گیارہ رسول (ان میں سے بارہواں یہوداہ اسکریوتی اس کا پکڑنے والا مرچکا تھا) بلکہ تمام دیگر مسیحی دعا کے لئے یروشلیم میں جمع تھے۔ ان سب پر جیسا کہ اعمال الرسل میں مرقوم ہے روح القدس کا نزول ہوا(اعمال الرسل ۲: ۱، ۱۳)۔ جس نےان کو ایمان ومحبت اورجوش وہمت اور سیدنا مسیح کی تعلیم کی یاد سے بھر دیا (یوحنا ۱۴: ۲۶)۔ اور بتدریج عرفانِ حق کے کمال تک پہنچادیا (یوحنا ۱۶: ۱۳)جو خدا چاہتا تھا کہ وہ حاصل کریں اور پھر اوروں کو اس کی تعلیم دیں۔ اس امر کے نشان کے طور پر کہ ان کو تمام اقوام میں انجیل سنانا تھا ان کو اس روز غیر زبانیں بولنے کی توفیق ملی (اعمال الرسل ۲: ۴)۔ اگرچہ پھر ہم کو کہیں اس کا ذکر نہیں ملتا کہ انہوں دوردست غیر ممال میں وہاں کی زبانیں سیکھنے کے بغیر انجیل کی بشارت دی۔ خدا نے اس وقت ان کو غیر زبانیں بولنے کی توفیق بخشی لیکن یہ فقط نشان کے طورپر ہوا نہ اس لئے کہ وہ غیر زبانیں سیکھنے میں سست ہوجائیں۔ رسولوں میں سے بعض کو یہ توفیق بھی ملی کہ بیماروں کو شفا بخشنے میں ایسے معجزے دکھائیں جیسے کہ خود سیدنا مسیح نے دکھائے تھے(اعمال الرسل ۲: ۴۳، ۳: ۱-۱۱، ۵: ۱۲-۱۶، ۸: ۷، ۹: ۳۱-۴۳)۔ لیکن یہ معجزے مسیح کے نام اوراسی کی قدرت واختیار سے کئے گئے تھے (اعمال الرسل ۳: ۶، ۱۶)۔ نہ کہ رسولوں کی اپنی قدرت سے ۔پھر چند سال بعد جب پولوس کو رسالت کا درجہ عنایت ہوا تواس کو بھی دوسرے رسولوں کی طرح معجزات کی قدرت وتوفیق بخشی گئی ۔بیماروں کو شفا بخشنے کے اس کے بہت سے معجزات اعمال الرسل میں مرقوم ہیں (اعمال الرسل ۱۴: ۸-۱۰، ۱۹: ۶، ۱۱، ۱۲، ۲۰: ۹، ۱۰، ۲۸: ۸، ۹)۔ معجزات شفا بخشی کی قدرت ایک محدود وقت کے لئے دی گئی تھی اور رسولوں کی وفات کے ساتھ ہی غالباً اس کا خاتمہ ہوگیا۔ اگر یہ قدرت مسیحیوں میں دائمی طور پر قائم رہتی تو یہ ایسی عام اور معمولی سی بات متصور ہونے لگ جاتی کہ اس سے شہادت کی خوبی جاتی رہتی لیکن مسیحی کلیسیا کے ابتدائی زمانہ میں ایسی معجزانہ قدرت نہایت ضروری تھی۔ اس سے ان کا ایمان مضبوط ہوتا تھا جو مسیح پر ایمان لانے کے سبب سے ستائے جاتے تھے۔ ہم کو کہیں سے بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ سیدنا مسیح یا اس کے رسولوں نے بے ایمانوں کو قائل کرنے کے لئے کبھی معجزات کو استعمال کیا۔

انجیل کی منادی میں روح القدس رسولوں کا مددگار تھا۔ پس انہوں نے اپنے خیالات کو پیش نہیں کیا بلکہ اس تعلیم کو جو ان کو خدا کی طرف سے ملی تھی(مرقس ۱۳: ۱۱، یوحنا ۱۴: ۲۶، رومیوں ۱۵: ۱۸، ۱۹۔ ۱کرنتھیوں ۲: ۱۲، ۱۳، ۱تھسلنیکیوں ۲: ۱۳،)لہذا جوکچھ انہوں نے اوران کے شاگردوں نے الہٰی الہام سے قلمبند کیا ہم اسے سیدنا مسیح کے قول کے مطابق دنیا کے لئے خدا کا پیغام مانتے اور قبول کرتے ہیں کیونکہ سیدنا مسیح نے فرمایا ہے" جو تمہاری سنتا ہے وہ میری سنتا ہے اورجو تمہیں نہیں مانتا وہ مجھے نہیں مانتا اور جو مجھے نہیں مانتا وہ میرے بھیجنے والے کو نہیں مانتا"(لوقا ۱۰: ۱۶)۔ پس سیدنا مسیح کے رسولوں کا دعوایِ رسالت بالکل بجاہے (۱کرنتھیوں ۱: ۱۔ گلتیوں ۱: ۱-۱ پطرس ۱: ۱ وغیرہ)۔

رسولوں کی منادی کے وسیلہ سے خدا کی قدرت اور سیدنا مسیح کی پاک زندگی کی تاثیر کا ایسا کامل اظہار ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہزارہا یہودی اوران کے کاہنوں میں سے بہت سے مسیحی ہوگئے (اعمال الرسل ۲: ۴۱، ۴: ۴، ۶: ۱، ۲۱: ۲۰)۔ غیر اقوام میں بھی انجیل خوب پھیلتی چلی گئی اوران میں سے بہت سے تاریکی سے نکل کر نور میں داخل ہوئے ۔ شیطان کے نیچے سے آزاد ہوکر خدا کے پاس پہنچے اور بُت پرستی سے دست بردار ہوکر زندہ اورحقیقی خدا کی عبادت کرنے لگے (۱ تھسلنیکیوں ۱: ۱۰)۔

مسیحی معجزات کا بیان نہ فقط عہدِجدید اور قدیم زمانہ کے مسیحی مصنفین [1]ہی کی تصانیف میں پایا جاتا ہے کہ یہودی بھی اپنی تالمود میں ان کا ذکر کرتے ہیں اگرچہ وہ ان کو اپنے کفرآمیز بیان سے جادوگری سے منسوب کرتے ہیں۔ سنہ مسیحی کی پہلی چند صدیوں کے بے دین مصنفین میں سے بھی بہتوں نے مثلاً پلینی ٹیسیلٹس، سلیٹس اور ملحد شہنشاہ جولین نے مسیحی دین کی سریع اشاعت کی تصدیق کی ہے۔ بہت سے بادشاہوں نے اس دین کو صفحہ ہستی سے مٹادینے کے لئے ہر طرح کی کوشش کی لیکن ان کی تمام مخالفت کے باوجود یہ نیا دین پھیلتا چلا گیا اور غایت درجہ کا ظلم وستم اور سخت بے رحمی کے قتل بھی اس کو روک نہ سکے۔

ہمارے بعض مسلمان بھی کہتے ہیں کہ مسیح کے شاگردوں میں سے کسی کو بھی رسول کے لقب سے ملقب نہیں کرسکتے۔لیکن یہ کہنے سے وہ قرآن سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کرتے ہیں سورہ آل عمران آیت ۴۵، سورہ مائدہ آیت ۱۱۱، ۱۱۲، اور سورہ صف آیت ۱۴ میں مسیح کے شاگرد الحواریون کہلاتے ہیں اور سب اصحابِ علم خوب جانتے ہیں کہ یہ حبشی لفظ عربی رسول کا مترادف ہے۔ عہدِجدید کے حبشی ترجمہ میں لوقا ۶: ۱۳ میں اور تمام دیگر مقاموں پر رسول کے معنوں میں یہ لفظ استعمال کیا گیاہے۔ یہی لفظ سیدنا مسیح نے اپنے بارہ شاگردوں کے حق میں استعمال کیا تھا۔ حبشی لفظ حواری اس مادہ سے مشتق ہے جس کے حبشی زبان میں ٹھیک وہی معنی ہیں جو کہ عربی زبان میں رسل کے ہیں۔ اس مبحث کے متعلق کوئی دیندار مسلمان قرآن کی تعلیم کی مخالفت کی جرات نہیں کریگا اوراس سے انکار نہیں کریگا کہ سیدنا مسیح بارہ شاگردوں کو یہ لقب دینے میں راستی پر تھے۔ پولوس کو بعد میں سیدنا مسیح نے آسمان پر سے مخاطب ہوکر رسالت کے رُتبہ پر سرفراز فرمادیا تھا(اعمال الرسل ۲۲: ۲۱ ورومیوں ۱۱: ۱۳، ۲کرنتھیوں ۱۲: ۱۲- ۱تیمتھیس ۲: ۷)۔ انجیل کی منادی اور مسیحی دین کی اشاعت میں ان رسولوں کی کامیابی ان کی رسالت کا ثبوت تھی کیونکہ یہ ان کے کام پر خدا کی مہر تھی۔

"اظہر من الشمس ہے کہ مسیحیوں کو اپنے دین کی اشاعت کے لئے جہاد کی اجازت نہیں تھی کیونکہ جب پطرس نے اپنے آقاو مولا کی حفاظت کے لئے تلوار کھینچی تو ایسے موقع پر بھی سیدنا مسیح نے فرمایا تھا" اپنی تلوار کو میان میں کرلے کیونکہ جو تلوار کھینچتے ہیں وہ سب تلوار سے ہلاک کئے جائینگے "(متی ۲۶: ۵۲)۔ علاوہ برین مسیح کو ریاکاری سے سخت نفرت ہے اوروہ ریاکاری کی سخت مذمت کرتے تھے۔ جب کسی آدمی کو ایذا رسانی سے اپنا دین تبدیل کرنے پر مجبور کیا جائے تو کیا اسے ریاکار نہیں بنایا جاتا ؟جبر کسی کو سچا مسیحی نہیں بناسکتا۔لہذا قدیم زمانہ میں مسیحی دین کی اشاعت جبر کے وسیلہ سے نہیں

[1] قرآن بھی مسیح کے معجزات کا ذکر کرتاہے۔ دیکھو سورہ آل عمران آیت ۴۳

ہوئی۔ زمانہ حال میں بھی جبکہ مسیحی اقوام کے نہایت طاقتور اور صاحبِ قدرت ہونے میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں ہے کسی کو مسیحی دین اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا کیونکہ جبر وتشدد سے ایمان پیدا نہیں ہوسکتا ۔ اگر کسی دین میں ایسے وسائل کے استعمال کی اجازت ہو تو یہ اس امر کا کافی ثبوت ہوگا کہ وہ دین ہر گز ہر گز من جانب اللہ نہیں ہے۔ بعض رسولوں نے مثلاً پطرس اور پولوس نے انجیل کی منادی کے کام میں سالہاسال تک محنت ومشقت اور دکھ تکلیف برداشت کرنے کے بعد جامِ شہادت کو پیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو ہمیشہ یہ نصیحت کرتے تھے کہ مسیح کی خاطر ہر طرح کے ظلم وستم اور رنج والم کو صبر کے ساتھ برداشت کریں۔ اس صبر ومحبت اور مہربانی نے بہتوں کو قائل کردیا کہ یہ لوگ فی الحقیقت خدا کے بندے ہیں اور ان کا دین برحق ہے۔ اس طرح سے شہیدوں کا خون کلیسیا کی بنیاد ٹھہرا۔ انسانی علم وفصاحت کے وسیلہ سے رسولوں نے بنی آدم کو خدا کی طرف رجوع نہیں کیا بلکہ بخلاف کے وہ نہایت سادہ اور معمولی زبان استعمال کرتے تھے(۱کرنتھیوں ۲: ۱، ۵، ۱۲، ۱۳) اور جب انہوں نے روح القدس کے الہام سے اس انجیل کو قلمبند کیا جس کی وہ منادی کرتے تھے اور نومریدوں کو خطوط کے وسیلہ سے سکھاتے تھے تو صاف اور تکلف وتصنع سے خالی طرز بیان اختیار کیا جو عام مردوزن کے معمولی بول چال کے موافق تھا تاکہ پڑھنے والے زیادہ آسمانی وسہولت کے ساتھ خدا کی رحمت ومحبت اور مہربانی وحکمت کو سمجھ سکیں اور اس رحمت ومحبت میں داخل ہو کر نجات حاصل کریں۔ کلام اللہ نہ فقط علماہی کے لئے بلکہ تمام بنی آدم کی ہدایت ورہبری کے لئے ضروری ہے۔ خدا کسی خاص آدمی کا لحاظ نہیں کرتا۔ وہ سب پر برابر مہربان ہے(زبور ۱۴۵: ۹)۔ لہذا یہ بات بالکل الہیٰ حکمت کے مطابق تھی کہ اس کا کلام وپیغام ایسی زبان میں لکھاجائے جس کو خواندہ وناخواندہ سب سمجھ سکیں کسی حد تک اسی سبب سے جب مشہور فیلسوف افلاطون نے " سقراط کی معذرت" کی لکھی تو اس زمانہ کی معمولی بول چال کی زبان استعمال کی تاکہ سب لوگ اس کو سمجھ سکیں۔

انجیلی تعلیمات نفسانی وجسمانی شہوات کو پورا کرنے کی خاطر کسی کی ہمت افزائی نہیں کرتیں اور وہ کسی کو یہ کہہ کر فریب نہیں دیتی ہیں کہ اگر کوئی مسیحی ہونے کا زبان سے اقرار کرے اور اپنے گناہوں میں بدستور سابق ڈوبا رہے تو دونوں جہان سے سزا سے بچ جائیگا(متی ۱: ۲۱، یوحنا ۸: ۳۴ ورومیوں ۶: ۱، ۲: ۱۱، ۱۵، ۲۳)۔ راہِ نجات ایسی کشادہ نہیں بیان کی گئی کہ انسان اپنے گناہوں سمیت اس میں سے گذر سکے بلکہ ایسی تنگ کہ اگر کوئی اس میں سے گذرنا چاہے تو گناہ کو ضرور پھینک دینا ہوگا(متی ۷: ۱۳، ۱۴)۔ مسیح اور اس کے رسولوں نے یہ تعلیم دی کہ گناہ شیطان کی غلامی ہے اور ایمانداروں کو بُری خواہشوں اور عادتوں سے آزاد کرنے کا وعدہ کیا اور ان سے یہ طلب کیا کہ جسمانی شہوتوں سے پرہیز کریں(۱پطرس ۲: ۱۱، ۱۲)اور مسیح کے وفادار سپاہی بنیں اور بُت پرستی وشیطان کی خدمت کی طرف واپس جانے کو مقابلہ میں موت کو بہتر سمجھیں۔ رسولوں نے فقط یا زیادہ تر غیر مہذب لوگوں ہی میں کام نہیں کیا بلکہ انہوں نے تمام دنیا کے سب سے زیادہ تہذیب یافتہ ممالک یعنی اٹلی اور یونان میں انجیل سنائی اور خدا کے فضل سے بعض ایسے لوگ جو پہلے بدکاری میں زندگی بسر کرتے تھے نیکوکار بن گئے۔

رسولوں کے زمانہ میں بھی سیریا ومصر وایشیا کوچک ویونان ومقدونیہ اور اٹلی کے بُرے بڑے شہروں میں مسیحی جماعتیں جمع ہوئیں۔ جیسا کہ ہم

بیان کر آئے ہیں پہلے پہلے زیادہ تر تو یہودیوں میں سے ہی نومرید بنے لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد غیر اقوام میں بھی انجیل پھیل گئی ۔ مہذب دنیا کے ایک بہت بڑے حصہ میں اسرائیلی سوداگر وسیاح پائے جاتے تھے۔ جب یہ مسیحی ہوگئے تو اوروں کو تعلیم دینے کا وسیلہ بن گئے۔ جن یہودیوں نے انجیل کورد کیا وہ سب سے پہلے مسیحیوں کو ستانے والے ہوئے لیکن غیر اقوام نے بھی ایذا رسانی میں بہت جلد ان کی تقلید اختیار کی تو بھی رسولوں کی وفات کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ان کے منادوں کے صبر وایمان اوران کی سرگرمی ومحبت کے سبب سے اس زمانہ کی معلومہ دنیا کی انتہائی حدود تک انجیل پھیل گئی ۔ آخری کار رومی بادشاہوں نے یہ خیال کرکے کہ مبادا اس نئی تعلیم کے سبب سے ہمارے معبودوں کی عبادت موقوف ہوجائے اور سلطنت بھی جاتی رہے نہایت بے رحمی سے ایذارسانی شروع کی۔ پہلی ایذا رسانی ، نیرو بادشاہ کے ماتحت شروع ہوئی جس کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے پطرس اور پولوس کو قتل کروایا اوران کے علاوہ اور بہت سے مسیحیوں کو اپنے بوستان سرای میں روشنی کرنے کے لئے رات کے وقت زندہ جلادیا[1] ۔اس زمانہ میں رومی لوگ بہت ہی بے دین تھے ۔ لیکن بادشاہ کو اپنا معبود بناتے تھے اورانہوں نے مسیحیوں سے بھی ایسا ہی کروانے کی بے فائدہ کوشش کی۔ ظالموں نے مسیحیوں کا مال ومتاع ضبط کرلیا اوران میں سے بہتوں کو نہایت بے رحمی سے مارڈالا۔ بعض روم میں درندوں کے آگے ڈال دئے گئے ۔ بعض زندہ جلائے گئے اور بعض طرح طرح کے عذاب سے مارے گئے ۔ تمام رومی سلطنت میں قریباً تین سو سال تک بار بار سخت اذیتوں کا طوفان برپاہوا جو کہ سکاٹلینڈ سے خلیج فارس تک اور بحر شمالی سے روس کی حدود اور بحیرہ اسود کے مشرقی ساحل تک پھیل گیا اور شمالی افریقہ۔ مصر ، فلسطین ، سیریا-ایشیایِ کوچک ، پوربی ترکستان، فرانس، جرمنی، آسٹریا، سپین، پرتگال ، برطانیہ اور بہت سے اورممالک اس کی طغیانی میں آگئے۔ اگرچہ رومی سلطنت عرصہ دراز تک اپنی پوری طاقت کے ساتھ مسیحی دین کی بیخکنی کی کوشش کرتی رہی تو بھی مسیحی کلیسیا نے خدا کی قدرت سے ایک محکم قلعہ کی مانند نہایت کامیابی کے ساتھ تمام حملوں اورصدموں کو برداشت کیا-اس طرح سے سیدنا مسیح کی وہ پیشنگوئی پوری ہوئی جس میں اس نے فرمایا ہے کہ اس کی کلیسیا پر تباہی غالب نہ آئیگی (متی ۱۶ : ۱۸) بااینہمہ ظلم وستم مسیحیوں کا شمار بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ آخر کار بہت سے مقامات پر بُت خانے متروک ہوگئے اور قربانیاں موقوف ہوگئیں۔ اگرچہ مظلوم مسیحیوں کا شمار بہت تھا تو بھی انہوں نے کبھی اپنے ستانے والے اور ظالموں کے خلاف بغاوت نہ کی بلکہ ان کے دشمنوں کی بے رحمی نے جو کچھ ان کے لئے تجویز کیا وہ سب انہوں نے کمالِ صبر کے ساتھ برداشت کیا۔

آخر کار قریباً ۳۱۴ء میں شہنشاہ کونسٹن ٹائن نے مسیحی دین کو قبول کیا اگرچہ اس کا بپتسمہ کئی سال کے بعد ہوا۔ اس وقت مسیحی لوگوں نے ظلم وستم سے نجات پائی لیکن اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بہت سے حقیقی دلی تبدیلی اورمناسب تعلیم کے بغیر کلیسیا میں شامل ہوگئے۔ ان میں سے بہت سے اپنے ساتھ بُت پرستوں اور بیدینوں کے خیالات وعقائد کو لیتے آئے اوراس سے بتدریج دین میں بدعتیں پھیل گئی۔ کُتُبِ مقدسہ کا مناسب اور ٹھیک طور سے

[1] Tacitus,Annaliax Lid.XV

مطالعہ نہیں ہوتا تھا۔ دلی پرستی کی ترویج واشاعت ہوگئی۔ بہتوں کی محبت ٹھنڈی ہوگئی اور دین نے روحانیت وپاکیزگی کو کھو کر ظاہر پرستی وظاہر داری کی صورت اختیار کرلی۔ ریاکاری اور جھگڑے فساد کی گرم بازاری ہوگئی اور بدعتیں بڑھ گئیں۔ خداوانسان سے محبت رکھنے کے عوض میں یہ بہت سے بپتسمہ یافتہ غیر مسیحی ایک دوسرے سے نفرت کرنےاور ریت اور رسموں کے بارے میں جھگڑے نے بلکہ ایک دوسرے کو ستانے لگے۔ لہذا ان میں سے بہت سے مہلک گناہ میں مبتلا ہوگئے اور بہتوں نے مریم پرستی اور بتُ پرستی کوجاری کردیا۔ یہ سب کچھ خدایِ پاک کی نظر میں نہایت نفرت انگیز تھا۔ لہذا جس طرح سے خدا نے اہلِ بابل واسیریا اوراہلِ مقدونیہ وروم کو بنی اسرائیل کی گوشمالی کے لئے استعمال کیاجبکہ وہ گناہ اور بُت پرستی میں گرفتار ہوگئے تھے اسی طرح مشرق کی بدعتی کلیسیاؤں کو سزا دینے کے لئے خدا نے اہل عرب کو اپنی تلوار کے طور پر استعمال کیا (مکاشفہ ۹: ۲۰، ۲۱)لیکن اب ہمارے زمانہ میں بہت سے مشرقی مسیحی بائبل کو بغور مطالعہ کررہے ہیں اور ان کے دل اور زندگی کو نورِحق منور کررہاہے ۔ اس طرح روح القدس کی ہدایت کے وسیلہ سے بہت سے سچے اور سرگرم مسیحی بنتے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کےوسیلہ سے خدا ان کے ہم وطن مسلمانوں کو مسیح کی انجیل کی روشنی سے روشن کررہاہے۔ تمام سچے مسیحی خواہ اور باتوں کے بارے میں ان کے درمیان کتنا ہی اختلاف ہو اس بات میں متفق ہیں کہ وہ انجیل کوقبول کرتے ہیں اور نتیجۃ کلمۃاللہ پر ایمان لاتے ہیں اور تمام جہان کے گناہوں کی معافی کے لئے اس کے کفارہ پر بھروسہ رکھتے ہیں ۔ خدا کرے کہ اس کتاب کے تمام معزز پڑھنے والے بھی اس نجات میں شریک ہوں جو زندہ مسیح ان سب کو فی الحقیقت اس پر ایمان لاتے ہیں مفت دیتاہے۔